نیاز فتحپوری کا ایک طویل اور مسلسل افسانہ

نغمۂ کارواں

آیندہ جنوری ۳۸ء سے شایع ہونا شروع ہوگا

اور

"تاریخ اسلامی ہند" اس کے علاوہ ہے۔

نگار

جلد ۳۲	فہرست مضامین نومبر ۱۹۳۷ء	شمار ۵

ملاحظات ... ۲
مذہب کا مستقبل ... ۹
مجنوں ... ۲۵
مفکرین عظام ... (سقراط) ۳۳
مالک کا بچہ ... ۴۲
ہمارے بزرگان ملت ... عبدالمالک آروی ...
انتقادیات ... ۵۲
مکتوبات نیاز ... ۵۷
باب الاستفسار ... ۶۱
مطبوعات موصولہ ... ۶۵
منظومات ... اثر، تمکین سرمست، مجاز، فطرت، الطاف، فراق، اختر ... ۷۳

نگار

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

معاون:- جلیل اعظمی

جلد ۳۲	نومبر ۳۷ء	شمار ۵

ملاحظات

مسلم لیگ کا غوغائے بے ہنگام

وسط اکتوبر کا وہ ہفتہ جو مسلم لیگ کے جلسوں کے لئے وقف تھا، ختم ہو چکا ہے اور اس کی کارروائیاں ملک کے تمام اخبارات و جرائد میں شایع ہو کر اہل ملک کے علم میں آچکی ہیں اس لئے اب کہ یہ تمام ہنگامے ختم ہو چکے ہیں اور تقریروں اور تجویزوں کا تمام لٹریچر سامنے آچکا ہے، ضرورت ہے کہ سکون کے ساتھ ہر شخص اپنی اپنی جگہ غور کرے کہ "مسلم لیگ" نے اپنے اس یادگار ہفتہ میں کیا نئی چیز پیش کی، ہمارے لئے کونسی راہ اس نے متعین کی اور وہ کونسے غیر متوقع برکات ہیں جو صاحبدلانِ لیگ کے اس مقدس اجتماع کی وجہ سے مسلمانانِ ہند پر نازل ہونے والے ہیں۔

اس میں کلام نہیں کہ لیگ کا یہ اجلاس کثرتِ شرکاء کے لحاظ سے غیر معمولی اجلاس تھا اور اگر محض سامعین کی کثرت کسی جلسہ کی کامیابی کی دلیل ہو سکتی ہے تو خداوندانِ لیگ اس کامیابی پر یقیناً مبارکباد کے مستحق ہیں، لیکن اگر کسی جلسہ کی کامیابی کے لئے اجتماعی روح اور مضبوط اصول کارکا پایا جانا بھی ضروری ہے تو ہمیں افسوس ہے کہ

لیگ کے جلسے مطلق کامیاب نہیں ہوئے۔ کیونکہ لیگ کی کارروائیوں کا تجزیہ کرنے پر صرف دو چیزیں آپ کو نظر آئیں گی۔ "نوحہ و ماتم اور سب و شتم"۔ ماتم اپنی خستہ حالیوں پر، گالیاں مخالف جماعت پر۔ اور ظاہر ہے کہ جس جلسہ میں انجمن استقبالیہ کے صدر راجہ صاحب محمود آباد ایسے لوگ ہوں وہاں سوائے اس "ہائے ہائے۔ وائے وائے" کے اور ہو بھی کیا سکتا ہے۔ رہے مسٹر جینا سو ان کی اسلام دوستی تو اسی وقت ظاہر ہو گئی تھی جب تحریک خلافت کے سلسلہ میں وہ کانوں پر ہاتھ رکھ کر مسلمانوں سے علٰحدہ ہوئے اور کامل چار سال تک ایسا زبردست خوف ان پر طاری رہا کہ مسلم لیگ کا نام سنکر ان کے جسم پر لرزہ طاری ہو جاتا تھا

راجہ صاحب محمود آباد نے اپنے استقبالیہ خطبہ میں یونتو جو کچھ فرمایا ہے خوب ہے، لیکن دو تین باتیں اس قدر عجیب و غریب کہی ہیں کہ ان کو سنکر اندیشہ ہوتا ہے کہ کہیں ان کے "دست و بازو" کو نظر نہ لگ جائے۔ فرماتے ہیں:۔

"ہم نے اپنے برادران وطن کو بار بار یقین دلایا ہے کہ جنگ آزادی میں ہم ان کے دوش بدوش کھڑے ہونے کے لئے طیار ہیں"

اگر اس ہم میں راجہ صاحب کی ذات بھی شامل ہے تو حیرت ہوتی ہے کہ یہ الفاظ ان کی زبان سے نکلے کیونکر۔ یہ راجہ صاحبان اور تعلقہ داران جو ایک ایک فرنگی کو اپنا "معبود" سمجھتے ہیں، جن کا سرمایہ دارانہ عیش و نشاط صرف برطانوی رحم و کرم پر منحصر ہے، اور جو اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ ملک کا آزاد ہونا ان کی ہلاکت کا مترادف ہے آزادی کا لفظ زبان سے نکالنے کا یقیناً کوئی حق نہیں رکھتے اور اگر وہ ایسا کرتے ہیں تو اس کے معنے یہ ہیں کہ دنیا کو دھوکا دینا چاہتے ہیں کیونکہ ان کا دل اُن کی زبان کا ہم آہنگ نہیں اور ان کا مقصود اس سے صرف یہ ہے کہ کانگریس کی راہ میں حایل ہو کر وہ برطانوی ملوکیت کو قوت پہونچائیں۔ اور ایسا ہونا چاہئے کیونکہ اگر سال بھر تک گورنر کے ساتھ متعدد ڈنر کھانے کے بعد اتنا بھی حقِ نمک انھوں نے ادا نہ کیا تو آیندہ خوانِ حکومت سے ریزہ چینی کی کیا امید ان کی وابستہ ہو سکتی ہے۔

راجہ صاحب بالقابہ اسی دعوائے آزادی کی تکرار دوسری جگہ ان الفاظ میں کرتے ہیں:۔

"آج یہاں کوئی ایسا مسلمان موجود نہیں ہے جو خیال اور عمل کی آزادی کا خواہاں نہ ہو اور جو آزاد ملک میں رہنے کا خواہشمند نہ ہو۔ جو لوگ ہم کو رجعت پسند کہتے ہیں ان کو یاد رکھنا چاہئے کہ وہ مسلمانوں سے خطاب کر رہے ہیں، جن کے مذہب نے انھیں آزادی کی تعلیم دی ہے اور جس کے بغیر وہ صحیح معنے میں زندہ نہیں رہ سکتے۔

جس جلسہ میں مسلمانوں کی موجودگی کا ذکر راجہ صاحب نے کیا ہے اس میں سب سے بڑی ہستیاں راجہ صاحب محمود آباد اور مسٹر جینا کی تھیں اور اس لئے اصولاً انھیں کو سب سے بڑا مسلمان کہنا چاہئے، سو اس باب میں ہمیں اس سے زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اگر اسلام محدود ہے برہنہ پا تعزیوں کے ساتھ صرف کربلا تک جانے کی حد تک یا

سال بھر میں صرف تین بار مسجد میں جاکر شرکتِ نماز کی حد تک، تو ان دونوں کے بڑے مسلمان ہونے میں شک کرنا یقیناً کفر کے مترادف ہے، ورنہ یوں کس کو نہیں معلوم کہ زنجبار اور شریعت بل کے مسایل میں جینا نے کیا کیا اور اتحاد ملت کے لئے راجہ صاحب محمود آباد کیا کر رہے ہیں۔

راجہ صاحب نے نہایت پرزور الفاظ میں ظاہر کیا ہے کہ "اسلام نے انھیں آزادی کی تعلیم دی ہے اور اسکے بغیر وہ صحیح معنے میں زندہ نہیں رہ سکتے"۔ لیکن آزادی کا کوئی مفہوم انھوں نے متعین نہیں کیا۔ تاہم قیاس یہی ہے کہ اس میں وہ جبیں سائیاں ضرور شامل ہوں گی جو آستانۂ برطانیہ کے حضور میں پیش کی جاتی ہیں ورنہ ظاہر ہے کہ وہ اپنے آپ کو مسلمان کیوں کہتے۔

راجہ صاحب اپنے خطبۂ صدارت میں ایک جگہ اور عجیب و غریب انکشاف سے کام لیتے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے کہ:-

> "مسلمانوں کی شرکت کے بغیر کوئی سیاسی جدوجہد مناسب اور کافی طور پر عمل میں نہیں آسکی، جب ہم قومی جنگ میں کود پڑے تبھی ہندوستان کے لئے حکومت خود اختیاری عملی سیاسیات کی حدود میں آسکی"۔

بجا ارشاد ہوا۔ سیاسیات ہند تو خیر بڑی چیز ہے، مسلمان رہنماؤں نے سیاسیات قومی میں بھی جس جد و جہد سے کام لیا ہے وہ یا تو حماقت پر مبنی رہی ہے یا خود غرضی پر۔ اس "فرقۂ زہاد" سے الا ماشاء اللہ کوئی ایک شخص بھی ایسا نہیں اُٹھا جس نے صحیح معنے میں ایثار و خلوص سے کام لیا ہو اور اگر کوئی شخص ایسا نکلا بھی تو انجام کار وہ اپنا عقلی توازن ہاتھ سے کھو بیٹھا۔

راجہ صاحب فرماتے ہیں کہ جب "مسلمان قومی جنگ میں کود پڑے تبھی ہندوستان کے لئے حکومتِ خود اختیاری عملی سیاسیات کی حدود میں آسکی"۔ "عملی سیاسیات" سے مراد اُن کی غالباً جدید کانسٹی ٹیوشن ہے، اور اس میں شک نہیں کہ جدید کانسٹی ٹیوشن جس پر ہندوستان کی کوئی جماعت مطمئن نہیں مسلمانوں ہی کی احمقانہ و بزدلانہ شرکت کا نتیجہ ہے اور اگر راجہ صاحب کو مسلمانوں کی یہی حرکت زیادہ محبوب نظر آتی ہے تو سوائے اسکے اور کیا کہا جاسکتا ہے۔

خجلت نگر کہ در حسنا تم نیاختند
جز روزۂ درست زصہبا کشودۂ

اس میں شک نہیں کہ مسلم لیگ کے اس اجلاس کی کامیابی، جس حد تک روپیہ صرف کرنے کا تعلق ہے، سراسر راجہ صاحب کی ممنون احسان ہے اور جس حد تک اجتماع کا تعلق ہے، سرمایہ داروں، زمینداروں اور خان بہادروں کی مرہون منت ہے۔ لیکن اگر راجہ صاحب نے غریب کاشتکاروں سے حاصل کیا ہوا روپیہ ان امرا و مساکین پر

اس لئے صرف کیا ہے کہ وہ مسلمانوں میں کوئی قایدانہ حیثیت حاصل کرلیں تو ہمیں افسوس ہے کہ یہ سودا ناکام رہا کیونکہ اُن کے والد مرحوم کا زمانہ اب باقی نہیں رہا جب جسم میں صرف سوئی چبھو کر انسان مجاہد اعظم کا لقب حاصل کرسکتا تھا۔ اسوقت ضرورت سرفروشی کی ہے، اور یہ ہم جانتے ہیں کہ ان کا "سرِ عزیز" اس سے بہت زیادہ قیمتی ہے کہ سیاسیات ایسے معمولی کھیل میں اس کی بازی لگائی جائے۔

استقبالیہ کمیٹی کے خطبۂ صدارت کے بعد دوسرا اہم لٹریچر جو مسلم لیگ نے پیش کیا اور جس کی طرف تمام اسلامی ہند کے کان لگے ہوئے تھے وہ مسٹر جینا کا خطبہ تھا۔ لیکن آپ مجھ سے نہ پوچھئے خود پڑھئے اور فیصلہ کیجئے کہ مسلمانوں کے اس قایدِ اعظم نے کونسا معجزۂ عمل ایسا پیش کیا ہے جو ہماری تجدیدِ حیات کا ضامن ہو۔ اور سوائے کانگریس کو گالیاں دینے کے "لب لعلِ شکر خا" سے اور کیا فرمایا گیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ مسٹر جینا کا یہ خطبہ تعلیماتِ اسلامی کی صحیح تفسیر ہے۔ بیشک تفسیر ہے مگر صرف "تبت یدا" کی "لا تفسدو فی الارض" سے اس میں کوئی بحث نہیں کیگئی۔

خیال کیا، یقین تھا کہ مسٹر جینا کا یہ خطبہ ہماری قومی زندگی کو سنوارنے کے لئے کوئی خاص لائحۂ عمل پیش کریگا، ہماری اقتصادی دشواریوں کا کوئی حل بتائے گا، ہمارے افتراق کو دور کرکے کسی خاص مرکزِ عمل کی طرف رہنمائی کریگا اگر کانگرس واقعی مردود و مبغوض چیز ہے تو اس سے بلند تر کوئی اور نصب العین ہمارے لئے متعین کرے گا لیکن کسقدر حیرتناک امر ہے کہ پورے خطبۂ صدارت میں کوئی ایک لفظ بھی ایسا نظر نہیں آیا جو کانوں سے گزر کر دل تک پہونچتا۔ وہی معمولی آدمیوں کی سی معمولی باتیں، وہی بہت کچھ کہکر کچھ نہ کرنے والوں کی سی لفاظیاں، وہی وقتی جوش سے فایدہ اُٹھاکر عارضی ہنگامہ پیدا کرنے والی ترکیبیں اور وہی سب کچھ جو خلوص و صداقت سے معرّا باتوں میں ہوتا ہے مسٹر جینا کے خطبۂ صدارت میں بھی تھا۔

ایک طرف "توحید کی امانت" کا بھی ذکر تھا، تیغوں کے سایہ میں پلکر جوان ہونے کا بھی دعویٰ تھا، اور دوسری طرف "مجاہدین بدر و اُحد" کی اس دلیرنسل کی زبان پر یہ بھی تھا کہ "کانگرس ہندوؤں کی جماعت ہے اور ہندو ہم کو تباہ کردیں گے"۔

ہم مانتے ہیں کہ کانگرس میں ہندوؤں کی اکثریت ہے، اس کی تنظیم یکسر ہندو ذہنیت پر مبنی ہے اور تھوڑی دیر کے لئے ہم یہ بھی فرض کئے لیتے ہیں کہ ہندو جماعت مسلمانوں کو مٹا دینا چاہتی ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ کیا فاتحین مصر و ایران اور فرمانروایان ہند و افغانستان کی اولاد اب ایسی بزدل ہوگئی ہے کہ جس جماعت کو وہ اپنا دشمن جانتی ہے سی کو وہ آزاد چھوڑ دینے پر مجبور ہے۔ کیا مسٹر جینا اور ان کے رفقاءِ کار اتنی عقل بھی نہیں رکھتے کہ اگر کانگرس کو مطلق العنان چھوڑ دیا گیا اور اس کی کانسٹی ٹیوشن کو برابر ہندو ذہنیت کے ساتھ بدلتے رہنے دیا گیا تو اسکا نتیجہ یقیناً وہی ہوگا جس کا اندیشہ ہے ــــ مسلمانوں کی تاریخ بتاتی ہے کہ انھوں نے دشمن کے مقابلہ میں صرف

دفاعی پہلو کو کبھی ترقی کا ذریعہ قرار نہیں دیا، ان کا قدم جب اُٹھا آگے ہی بڑھا اور ان کی پالیسی ہمیشہ یہی رہی کہ مخالف عنصر کو مغلوب کر کے اس کی قوت کو توڑ دیا جائے۔ لیکن افسوس ہے کہ اب مسلمانوں کو کانگرس کی ہندو ذہنیت مغلوب کرنے کا صحیح طریقہ یہی ایک نظر آتا ہے کہ اس سے علٰحدہ رہکر اس کے نشو و نما کو اور زیادہ ترقی کا موقعہ دیا جائے۔

کانگرس خالص سیاسی جماعت ہے جو بالکل اقتصادی اُصول پر کام کرنا چاہتی ہے اور اس میں اختلاف مسلک و مذہب کو مطلق کوئی دخل نہیں، اس لئے اگر مسلمان کانگرس کے مقاصد میں تبدیلی پیدا کرنا چاہتے ہیں اور اسکی ہندو ذہنیت کو مٹانا ضروری سمجھتے ہیں تو اس کا طریقہ صرف یہی ہے کہ اس پر جا کر چھا جائیں نہ یہ کہ اس کو اپنے اوپر چھا جانے دیں۔

میں نے بعض لوگوں کو یہ کہتے سُنا ہے کہ مسلمانوں کی اکثریت کبھی کانگرس میں نہیں ہو سکتی کیونکہ ۴۲ کروڑ کی تعداد بہرحال ۸ کروڑ سے زاید ہوتی ہے، اور یہ سنکر ہمیشہ مجھے تکلیف پہونچی ہے کیونکہ اس اندیشہ میں جو ذہنیت کام کر رہی ہے وہ ۴۲ کروڑ کو دیکھتی ہے اور ۸ کروڑ کو بجائے خود جو اہمیت حاصل ہے اس کو نظر انداز کر دیتی ہے اتنی بڑی جماعت کی یہ بزدلانہ رفتارِ خیال ارتقائی نقطۂ نظر سے اتنی گری ہوئی چیز ہے کہ دنیا کی کسی قوم نے اپنی انتہائی پستی کی حالت میں بھی اس کا اظہار نہیں کیا۔ علاوہ اس کے یہ اندیشہ کرنے والوں کو سمجھنا چاہئے کہ ہر چند ۴۲ کروڑ اور ۸ کروڑ میں بہت فرق ہے لیکن ہندوؤں کی اتنی بڑی آبادی میں نصف سے زیادہ وہ ہے جو قطعاً غیر ہندو ہے اور اسی بنا پر گاندھی جی نے ہریجن تحریک قایم کی تھی تاکہ ہندوؤں کی اکثریت واقعی اکثریت کی شکل پیدا کرلے۔ برخلاف اس کے مسلمانوں کی آبادی کا بڑا حصہ "منتخب حصہ" ہے اور اس لئے اگر آج صرف وہی حصہ کانگرس میں شرکت کا عزم کرلے تو کبھی ہندوؤں کی اکثریت کانگرس میں نہیں ہو سکتی۔

مسلم لیگ کے اس یادگار جلسہ میں سب سے زیادہ عجیب و غریب چیز وہ تھی جو بنگال سے آئی تھی۔ اس چیز کا نام مسٹر فضل حق تھا۔ یہ چیز چلتی پھرتی تھی، کھاتی پیتی تھی، لیکن کہا جاتا ہے کہ بولتی خوب تھی اور "در پسِ آئینہ" گالیوں کی اتنی اچھی مشق اسے کرائی گئی تھی کہ عجب نہیں بنگال میں ہمیشہ کے لئے یہ رولنگ ہو جائے کہ جب تک کوئی اتنی زہر افشاں نغمہ سنجی نہ کر سکے گا، کم از کم پریمیر کی جگہ کے لئے اس کا انتخاب عمل میں نہ آئے گا۔

مسٹر فضل حق نے دورانِ تقریر میں خود ہی اپنی گزشتہ سیرت پر تبصرہ بھی فرمایا ہے اور ہمیں حیرت ہے کہ اس تبصرہ کے پڑھنے کے بعد بھی مسلمان یہ یقین کرنے پر آمادہ نہیں کہ لیگ کے ساتھ ان کی ہمدردی حُبِ علی کی وجہ سے نہیں بلکہ "بغضِ معاویہ" کی بنا پر ہے اور اگر آج انھیں معلوم ہو جائے کہ وزارت کی ضروری شرط کبھی "ترکِ اسلام" بھی ہو سکتی ہے تو ہمیں توقع رکھنا چاہئے کہ سب سے پہلے انھیں کی پیشانی پر قشقہ نظر آئے گا۔

مسٹر فضل حق کا انتہائی جوش کی حالت میں یہ فرمانا کہ اگر ہندوؤں نے کسی صوبہ میں اپنی اکثریت سے فایدہ

اُٹھا کر مسلمانوں کو پریشان کیا تو وہ اس کا انتقام بنگال میں لیں گے، نہ صرف عالم سیاسیات بلکہ دنیائے تہذیب و شائستگی میں بھی ایک زبردست شاہکار ہے کہ اس خاکدانِ جہل و تاریکی میں تو اس کی مثال مل نہیں سکتی، ممکن ہے ملاءِ اعلیٰ کی مخلوق کوئی اس کی نظیر پیش کر سکے ۔۔ غضب خدا کا، صوبۂ بنگال ایسا اہم صوبہ اور اس کے وزیر اعظم کی یہ ذہنیت! جماعتِ اسلامی کا ایسا ذمہ دار فرد اور یہ سخافتِ خیال!

آسماں راحق بود گر خوں بگرید بر زمیں

اگر ذہن کی متانت و سنجیدگی اور خیال کی پاکیزگی و شرافت سے قطع نظر کر کے مسٹر فضل حق کی اس تدبیر کو واقعی کسی جنگ جویانہ تدبیر سے تعبیر کیا جائے تو بھی ہمیں افسوس ہے کہ اس سے زیادہ سفیہانہ و احمقانہ تدبیر کوئی اور ہو ہی نہیں سکتی۔ کیونکہ فرض کر لیجئے اگر ہندو مسلمانوں میں آج یہی مفاہمت ہو جائے کہ اکثریت کے لحاظ سے ہر صوبہ اپنے یہاں کی اقلیت کو پامال و تباہ کر سکتا ہے تو سوال یہ ہے کہ بہ حیثیت مجموعی نقصان کس جماعت کو پہونچے گا حیرت ہے کہ کانگرس میں شرکت کے وقت تو ۲ اور ۸ کی نسبت سامنے آجاتی ہے لیکن اس صورت میں اُسے نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔

مُسلم لیگ کے اجلاسِ سہ روزہ میں جتنی تقریریں ہوئی ہیں ان میں سے کوئی ایک بھی ایسی نہیں ہے جس سے غور و فکر، یا تفکر و تدبر ظاہر ہوتا ہو۔ وہی غیر ذمہ دارانہ زبان میں غیر ذمہ دارانہ باتیں، وہی کانگرس کا رونا، وہی مذہب و سیاسیات کے تصادم کا اندیشہ اور ان سب باتوں کی تہ میں وہی خود غرضی، و نفس پرستی جو ایک پست قوم کے رہنماؤں کی خصوصیت خاصہ ہوا کرتی ہے۔

مسلم لیگ میں جتنی تجاویز پیش ہوئی ہیں ان میں سے کوئی ایک بھی ایسی نہیں ہے جس میں مسلمانوں کے لئے کوئی تعمیری پروگرام سوچا گیا ہو یا اُن کی اقتصادی و تعلیمی پستی کی طرف توجہ کی گئی ہو۔ رہا یہ دعویٰ کہ مسلم لیگ نے کانگرس کے برخلاف اپنا نصب العین صحیح معنے میں مکمل آزادی قرار دیا ہے، سو اس کی حقیقت تجاویز کے ان کمزور الفاظ اور گدایانہ لب و لہجہ سے ظاہر ہے جس سے خان بہادرانہ التجا اور تعلقہ دارانہ فدویت تو ضرور ظاہر ہوتی ہے لیکن مردانہ عزم و مطالبہ کا اس میں کوسوں پتہ نہیں ۔ مسلم لیگ والوں کا کانگرس پر یہ اعتراض ہے کہ اس نے وزارت قبول کر کے حکومت کے طیار کئے ہوئے اُس کانسٹی ٹیوشن کو منظور کر لیا جو کسی طرح قابل قبول نہ تھا اور اس طرح اپنا نقطۂ نظر محدود کر کے صحیح آزادی کے مطالبہ کو ضعیف کر دیا۔ مانا کہ کانگرس کا وزارت قبول کر کے اس ناقابل قبول کانسٹی ٹیوشن کو چلانا آزادی کے منافی تھا، لیکن لیگ کی طرف سے مسلم پارلیمنٹری بورڈ کا قیام الکشن کے لئے جد و جہد اور وزارت میں شامل ہونے کے لئے بیتابی کیا معنی رکھتی تھی۔ اگر تشکیل وزارت سے انکار کر دینا ہی صحیح راستہ تھا اور آئین جدید کے خلاف احتجاج کی بھی بہتر صورت تھی جس کو کانگرس نے نظر انداز

کر دیا، تو مسلم لیگ کو کس نے مجبور کیا تھا کہ وہ اس صراطِ مستقیم سے ہٹ جائے اور کانسٹی ٹیوشن چلانے کے جرم میں کانگریس کی مدد کرے۔ بالکل درست فرمایا کہ اسوقت ملک میں جو بیداری پائی جا رہی ہے وہ سب مسلم لیگ ہی کی پیدا کی ہوئی ہے اور اگر اس کمبخت کانگریس کا قدم درمیان نہ ہوتا تو شاید مقصود کب کا حاصل ہو چکا ہوتا۔ سچ ہے

کارِ زلفِ تست مشک افشانی اما عاشقاں
مصلحت را تہمتے بر آہوچیں بستہ اند

حقیقت یہ ہے کہ برطانوی حکومت بڑی خوش اقبال حکومت ہے کہ ٹھیک اسی وقت جبکہ اس کی تعمیر متزلزل ہونے لگتی ہے کوئی نہ کوئی "مردِ غیب" ظاہر ہو کر "پشتی بان" بن جاتا ہے۔ اس مرتبہ جبکہ تعمیر حکومت بہت زیادہ خطرہ میں ہے "جینا و شرکاؤہ" نے سب سے زیادہ قوی "پشت پناہ" بننے کا فخر حاصل کیا۔ اور یہ وہ عزت ہے جو سوائے "خاصانِ خدا" کے مشکل سے کسی اور کو حاصل ہو سکتی ہے۔

پہلے ہندوستان دو ٹکڑوں میں منقسم تھا۔ برطانوی ہند اور کانگرسی ہند۔ لیکن اب ایک اور نیا ٹکڑا "لیگی ہند" کا بھی پیدا ہو گیا ہے اور اس "ایجاد و اختراع" کا امتیاز قدرت نے صرف مسٹر جینا ہی کے لئے مخصوص کر دیا تھا۔ اور خدا کی اس عنایت پر "رشک و غبطہ" فضول ہے

اگر آئندہ جنوری ۳۸ء کا "نگار" آپ نے نہ دیکھا

تو

نیاز فتحپوری کی دو بہترین کتابوں سے آپ محروم رہیں گے

ایک — تاریخ اسلامی ہند جو بالکل جدید اصول پر انتہائی تحقیق کے ساتھ لکھی گئی ہے،

دوسری — "نغمۂ کارواں" ایک مسلسل افسانہ جو بالکل نئی تخیل کے ساتھ

جنوری ۳۸ء سے شایع ہونا شروع ہوگا اور دسمبر ۳۸ء تک جاری رہیگا

اس کی اطلاع اپنے احباب کو بھی کر دیجئے!

جنوری ۳۸ء کا نگار حسب معمول دو چند ضخامت کا ہوگا اور غیر خریداران نگار سے فی کاپی ۸ء علاوہ محصول اس کی قیمت لیجائے گی

مینجر نگار

مذہب کا مستقبل

اس وقت دنیا مذہب کی طرف سے کافی بدگمان ہو چکی ہے اور اس کا مستقبل بہت تاریک نظر آتا ہے لیکن یہ خیال کرنا کہ یہ مغرب کے اسی عہد کی برکت ہے درست نہیں۔ مذہب کی طرف سے انحراف کب اور کیونکر شروع ہوا، اس کا سراغ لگانے کے لئے ہم کو یورپ کی ذہنی تاریخ کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔

اُس دور میں جس کو ہم دورِ "نشاۃ ثانیہ" (Renaissance) یا "یورپ میں تہذیب و تمدن کی دوبارہ پیدائش" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ زندگی کے مختلف مسایل پر بحث کرنا ایک عام تفریح ہو گئی تھی، اُس زمانہ میں علمی حرارت اور تحقیق و تجسس کا ایسا جوش و ولولہ پایا جاتا تھا جو یورپ میں روم کی قیصریت کے فنا ہونے کے بعد پھر کبھی نہیں دیکھا گیا تھا۔ لوگوں کو اسوقت یہ پتہ چلا کہ دنیا میں ایسے بھی مسایل پائے جاتے ہیں جن کا تصفیہ بس تذکرہ ہے اور نہ جن کے متعلق پادریوں کی زبانیں کھلتی ہیں۔ چنانچہ ایسے ہی مسایل زندگی پر لوگ اکثر آپس میں بحث کیا کرتے تھے۔ اس چیز کی ابتدا سب سے پہلے اٹلی میں ہوئی اور پھر یہ مباحث انگلستان اور فرانس تک پھیل گئے۔

اٹلی کا ایک مشہور عالم اور "سابق پادری" گیارڈینو برونو (Giordano Bruno) جب تک وہ قتل ہونے سے محفوظ رہا) برابر پادریوں اور ان کی مہمل تعلیمات پر اعتراض کرتا رہا اور پھر اُس نے لندن کو اپنا مستقل قیام گاہ بنالیا۔ یہاں اُس نے اور سر فلپ سڈنی نے (جسے انگلستان میں ایک "بے داغ ہستی" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے) مفکرین کا ایک ایسا حلقہ بنالیا جو انسان اور دنیا پر بحث کیا کرتا تھا۔

چونکہ اس دور کے اکثر افراد ملحدانہ خیالات کے بھی حامل تھے اس لئے وہ مذہب کے مستقبل پر بھی بحث کیا کرتے تھے۔ ان میں سے مشہور ڈرامہ نویس کرسٹوفر مارلو اور ملکۂ الزبتھ کا مشہور درباری سر والٹر ریلے ایک قسم کا کلب بنائے ہوئے تھے جہاں مذہب کے مستقبل پر انتقاد و تبصرہ ہوا کرتا تھا۔ ان میں سے اکثر لوگوں کو یہ یقین ہو گیا تھا کہ مذہب عیسوی باطل ہے کیونکہ علمی و تاریخی تحقیقات عیسویت کے افسانوں کو جھٹلا رہی تھیں۔ جہاز ران ایسے ممالک دریافت کر رہے تھے جو کبھی عیسیٰ کے خواب میں بھی نہ آئے تھے، منجم کائنات کے بارہ میں ایسے انکشافات کر رہے تھے جو عقل انسانی کی محدود چہار دیواری کی بنیادوں کو متزلزل کئے دے رہے تھے۔

لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی واقعہ ہے کہ یہ تحقیق و جستجو صرف ان لوگوں تک محدود تھی جن کے پاس فرصت تھی دولت تھی اور جو تمام دنیاوی علائق سے بے نیاز ہو کر اپنا سارا وقت اسی قسم کی تحقیق و تجسس میں صرف کرتے، ورنہ قوم کے زیادہ افراد جاہل تھے۔ وہ مطلق نہیں جانتے تھے کہ تحقیق جدید کیا ہے اور جب کسی بے دین یا ملحد، کو زندہ جلائے جاتے ہوئے دیکھتے تھے تو خوش ہوتے تھے۔ الغرض تعلیم یافتہ لوگ تو مذہب کو ناپسند کرتے تھے اور اس کے اصول سے انھیں اختلاف تھا لیکن قومی مصالح کی خاطر انھیں اپنے مذہب پر قایم رہنا پڑتا تھا۔

مگر ان تمام مباحث کے دوران میں ایک چیز کا فقدان تھا اور وہ "ارتقا کا خیال؟" تھا کسی کو یہ تصور بھی نہیں تھا کہ نظام معاشرت کسی وقت بالکل بدل جائے گا حتیٰ کہ جب سر ٹامس مور نے اپنی مشہور کتاب اٹوپیا (Utopia) لکھی تو بھی اُسے "باغی" نہیں سمجھا گیا کیونکہ اُس کتاب کے تجویز کردہ نظام معاشرت کے قوانین بالکل بعید از قیاس سمجھے گئے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اس نے انگریزی میں وہی چیز لکھی تھی جو اٹھارہ صدی قبل یونانی زبان میں افلاطون لکھ گیا تھا۔ تہذیب جدید کے نئے قوانین لوح آسماں پر لکھے جا چکے تھے مگر انسان کی آنکھیں اتنی ضعیف تھیں کہ وہ انھیں نہیں دیکھ پاتی تھیں اور اوہام پرستی کی پٹیاں ان پر بندھی ہوئی تھیں۔

لیکن اب ہماری نگاہوں میں زیادہ بصیرت پیدا ہو گئی ہے اور ہم ان مسائل کو ایسی صداقت کے معیار پر پرکھتے ہیں جس سے پہلے ہم لاعلم تھے۔ اب "قانون وقت" یا "امر حقیقت" لفظ "ترقی" (Progress) میں مضمر ہے۔

اگر واقعی نظام اشیاء کا کوئی قانون ابدی ہو سکتا ہے تو صرف یہ کہ ایک نظام کو دوسرے نظام میں تبدیل ہونا پڑیگا جیسے رات دن میں تبدیل ہوتی ہے۔ بہار، خزاں سے بدلتی ہے اور بچپن، جوانی سے بدلجاتا ہے۔ ابھی تک ہم اپنے "بزرگوں کی عقل" کی مثالیں پیش کیا کرتے تھے مگر موجودہ زمانہ میں اس فقرہ کو جو استعمال کرے اُسے بالکل احمق سمجھنا چاہئے ہمارے آباواجداد نہ یہ ہوائی جہاز بنا سکتے تھے، نہ ریل چلا سکتے اور نہ موٹر تو پھر ہم انھیں اپنے سے زیادہ عقلمند کیوں تسلیم کریں۔

بہرحال مذہب کو بھی بدلنا ہے اور نصف سے زیادہ دنیا اس کو تسلیم کر چکی ہے۔ وہ لوگ جن میں غور کرنے کی استعداد و صلاحیت موجود ہے اور ہمارے زمانہ کے وہ تعلیم یافتہ مرد و خواتین جن کو پڑھنے اور تصویر کے دونوں رُخ دیکھنے کا موقع ملتا ہے، ان میں سے اکثریت کو اس امر کا یقین ہو چکا ہے کہ مذہب مٹ جائے گا۔ اختلاف صرف اس بات پر ہے کہ انسانی آراء کی دوسری منزل کیا ہوگی۔

وہ پیشینگوئیاں جو ادبیات کی کتابوں میں بھری پڑی ہیں قابل تسلیم نہیں۔ اوایل اٹھارویں صدی میں بالمیز (Balmez) نے کہا تھا کہ پروٹسٹنٹ تہذیب (جرمنی ہالینڈ وغیرہ کی) ختم ہو رہی ہے، دنیا کے لئے پروٹسٹنٹ مصلحین کا پیغام بے اثر ثابت ہوا ہے اور کیتھولک سلطنتیں مثلاً فرانس، اسپین، پرتگال، آسٹریا وغیرہ دراصل دنیا

کی حکمران بن رہی ہیں۔ مگر اس پیشینگوئی کے نصف صدی بعد یہ دیکھا گیا کہ کیتھولک ممالک تنزل پذیر ہیں یا یہ کہ وہ اپنے سابقہ مذہب کو ترک کر چکے ہیں۔ عوام نے یہاں تک کہنا شروع کر دیا کہ پیس ثانی (Pius II) آخری پاپائے روما ہے۔ اس کے نصف صدی بعد لارڈ میکالے نے لکھا کہ پاپائے روم کا جھنڈا اُڑتا ہی رہیگا۔ آج سے ۲۰ برس قبل ایک پیشین گوئی یہ کی گئی کہ کیتھولک مذہب سب سے پہلے نیست و نابود ہوگا۔ اسکے بعد ایچ۔ جی۔ ولس نے یہ کہا کہ آج سے ایک ہزار برس کے بعد کے جدید شہروں میں بھی پیادہ پا راہب چلتے ہوئے دکھائی پڑیں گے۔

لہٰذا اس قسم کی پیشین گوئیوں کو سچا تسلیم نہیں کیا جا سکتا، گزشتہ عہد کی پیشین گوئیاں سیاسی یا فوجی نقل و حرکت اور تحریکات کی وجہ سے غلط ثابت ہو چکی ہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ اب جو پیشین گوئی کی جائے وہ بھی غلط نہ ثابت ہو، مذہب کے بارہ میں آج یہی نظریہ ٹوکیو میں بھی پایا جاتا ہے، اور پکنگ میں بھی، بمبئی میں بھی اور قاہرہ میں بھی، قسطنطنیہ میں بھی اور ماسکو میں بھی!

غرضکہ مقامی حالات کچھ ہوں، اقوام عالم اپنے مسایل پر اس وقت تک رائے زنی کرتی رہیں گی جب تک ان کا منطقی حل نہ معلوم ہو جائے۔ مگر یہ بھی واقعہ ہے کہ اس منطقی حل معلوم کرنے کے شرایط ہر دس برس کے بعد بدلجاتے ہیں اور ان میں سب سے بڑی شرط "علم" ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ ہر عہد میں ایک الحاد پسند قلیل اقلیت یونان، روم، قرطبہ، فلورنس اور تقریباً ہر مقام پر پائی گئی ہے اور آخر میں اس اقلیت کا خاتمہ ہو گیا۔ لیکن یہ نتیجہ تھا اس امر کا کہ "کلچر" صرف اعلیٰ طبقوں تک محدود تھا! اور اب یہ "کلچر" "جمہوری" ہے۔ آج ۵۰ کرور انسان پڑھ سکتے ہیں اور ۵۰ برس کے بعد ان کی تعداد دوچند ہو جائے گی۔

اب سوال یہ ہو سکتا ہے کہ مانا، دنیا ہمیشہ مذہب کے بارہ میں بحث کرتی رہے گی۔ لیکن یہی کیوں فرض کر لیا جائے کہ ان مباحث کا منطقی نتیجہ "الحاد و بے دینی" کی صورت میں ظاہر ہوگا اور یہ کہ کیا یہ چیز ان پیشین گوئی کرنے والوں کا رسمی "فریب" (Fallacy) نہیں ہے؟

یقیناً یہ ایک حقیقت ہے اور ایسا نہ کرنا چاہیئے۔ ہر پیشین گوئی کی سب سے بڑی کمزوری پیشینگو کی خود سری ہے وہ اپنے آپ کو اتنا عقلمند تصور کر لیتا ہے کہ جو کچھ میرے خیالات میں آنے والی نسل ان کو بے چون و چرا قبول کرے گی خصوصاً سیاسی و اقتصادی نظریات کا یہی حال ہے۔ چنانچہ کتابوں اور واعظوں کے لکچروں کو جب کوئی شخص دیکھتا اور سنتا ہے تو اُسے پتہ چلتا ہے کہ کیتھولک کو یہ یقین رہتا ہے کہ ساری دنیا اسی کی ہم خیال بن جائے گی، موحد کا یہ دعویٰ ہوتا ہے کہ وہ وقت آنے والا ہے جب وحدانیت تمام عالم کا ایمان بن جائے۔ بالآخر جارج برنارڈ شا آتا ہے اور وہ ان سب خیالات کو ٹھکرا کر ایک نئی بات کہتا ہے کہ مستقبل کا مذہب کیا ہوگا۔

الغرض ان معاملات میں صورت حال یکساں ہوتی ہے، پیشینگو کے دلایل بہت سادہ ہوتے ہیں وہ سمجھتا ہے

کہ حقیقت و صداقت سے میں ہی آشنا ہوں اور چونکہ تمام دنیا میری ہی طرح صداقت پرست ہونے والی ہے لہذا میری بتائی ہوئی صداقت کو ضرور تسلیم کیا جائے گا۔

مگر میں اپنے نظریہ کو اس طرح نہیں ثابت کرنا چاہتا ہوں۔ میرا خیال یہ ہے کہ مذہب، اپنی ہر شکل میں ایک دھوکا ہے، ایک وہم ہے اور میرا عقیدہ یہ ہے کہ انسانی زندگی اور انسانی فطرت کے پاس وہ ذرائع و اختیارات موجود ہیں جن کو مذاہب عالم نے ہم میں بڑھنے سے روکا ہے اور جب یہ تمام مظالم اور تمام دھوکے ختم ہو جائیں گے اور جب انسان کو اپنی صحیح طاقت کا اندازہ ہو جائے گا تو ایک ایسا نظام تیار ہو جائے گا جو موجودہ نظام سے کہیں زیادہ خوشگوار اور دلکش ہو گا۔

میں یہ اس وجہ سے نہیں کہتا کہ میرا یہ عقیدہ مجھے اصل "صداقت" یا "حقیقت" معلوم ہوتا ہے بلکہ میں یہ اس واسطے کہتا ہوں کہ دنیا اسی سمت جا رہی ہے۔ آگے چل کر میں "مذہب" کی داستان مختصر الفاظ میں بیان کروں گا۔

تجربۂ سابق مذہب کی داستان کئی ہزار برس کی پرانی داستان ہے۔ اور مذہب کی ابتدا تلاش کرنے کے لئے ہم کو "عہد حجری" سے بھی قدیم تر زمانہ کی طرف نظر دوڑانی پڑتی ہے۔ لیکن یہاں کسی مدت پر بحث کرنا مقصود نہیں بلکہ مدعا صرف یہ کہنا ہے کہ اپنے ابتدائی دور ہی سے مذہبی خیالات میں تدریجی ارتقا ہوتا رہا ہے۔ اس ارتقا میں کوئی تحریک جذبات نہ شامل تھی بلکہ تفکر و واقعات کا ایک منطقی تسلسل تھا یا جیسا کہ اعتدال پسند 'مذہبی' لوگ کہتے ہیں یہ ارتقا کسی بیرونی قوت کی طرف سے کوئی "الہام" نہیں ہے۔ اور اقوام عالم کی معیار عقل کے مطابق خدا نے اپنے آپ کو مختلف شکلوں میں ظاہر کیا ہے لیکن واقعات کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ مذہب پہلے ایک غیر مضرت رساں خیال تھا اور رفتہ رفتہ وہ بدتر ہوتا گیا۔

اگر تمام نسل انسانی برابر رفتار سے چلتی تو ہم آج مذہب کی ابتدا اور اس کے ارتقا کے بارہ میں کچھ نہ جانتے ہوتے مگر انسان نے اپنے تجربات صرف ۵-۶ ہزار برس پیشتر سے محفوظ رکھنا شروع کئے یہاں تک کہ فرضی داستانیں (Legends) بھی بہت پرانی نہیں ہیں۔ لیکن انسانوں کی یہ داستان ہر واقعہ سے اتنا متاثر ہوئی ہے کہ نسل انسانی کے مختلف حصوں نے عام ارتقا میں ہر منزل پر ترقی نہیں کی۔ بہر حال آج ہم دو انسانی سلسلے (Species) شمار کرا سکتے ہیں ایک تو ان "قبل تاریخ" (Pre-historic) قوموں کا سلسلہ جو لاکھوں برس پہلے گزری ہیں، دوسرے وحشیوں کا زمانہ یہ دونوں مدتیں تقریباً یکساں ہیں کیونکہ دونوں زمانۂ قبل تاریخ (Pre-historic age) میں گزری ہیں اور ان قوموں کے خیالات سے تفکرات انسانی کے ارتقاء کے گزشتہ منازل ہم کو معلوم ہو سکتے ہیں۔ اس کے بعد تہذیب قدیم کے مذہب کا پتہ پرانی عمارتوں سے چلتا ہے اور پھر ادبیات سے معلوم ہوتا ہے کہ مذہب کے بارہ میں لوگوں کے کیا خیالات تھے۔ ادب سے گزشتہ تین ہزار برس قبل کے اس مذہبی ارتقا کا حال معلوم ہوتا ہے

جو مختلف مذہبی مرکزوں مثلاً چین، ہندوستان، ایران، یونان، روم اور مصر وغیرہ میں عیسائیت کے قبل پایا جاتا تھا اور جو سبق اس سے ہم کو ملتا ہے وہ اُس کے بالکل مطابق ہے جو اُس وقت سے اس وقت تک ہوتا رہا اور اب بھی ہو رہا ہے۔ قصہ مختصر یہ کہ ہر قسم کی آب و ہوا اور ہر قسم کی اقتصادی حالت میں مذہب کا ارتقا اتنا یکرنگ و یکساں رہا ہے کہ خود ایک مذہبی آدمی اس کا مستقبل دیکھ سکتا ہے، جن واقعات نے انسانی ترقی کو (ایسے ممالک میں جہاں ترقی کے وسایل تھے) روک دیا وہ لڑائیاں اور ایسی غلطیاں تھیں جو ہمیشہ تہذیب کو مٹاتی رہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ الحادی زمانہ میں پھیلا جب تہذیب اپنے انتہائی عروج پر ہوئی اور جب تخریبی قوتوں نے علم کو مٹا دیا اور جہالت کا دور دورہ ہوا تو الحاد کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ جب علم کی ترقی ہوتی ہے تو مذہب کی بنیادیں کمزور ہو جاتی ہیں اور جب تہذیب مٹنے لگتی ہے تو اس میں پھر قوت آجاتی ہے۔

مذہب اور فطرت انسانی

میری رائے میں مذہب کی ابتدا کا حال بالکل ایسا ہی ہے جیسے پرانے زمانے کے حبشی کا تصور اپنے سایہ کے بارہ میں۔ میں نے دیکھا ہے کہ اگر کسی کتے کو عمر میں پہلی مرتبہ ژالہ باری سے سابقہ پڑے تو وہ بے انتہا حیرت زدہ ہو جاتا ہے یا اگر کوئی بلی پہلی مرتبہ کسی کچھوے کو رینگتے ہوئے دیکھتی ہے تو وہ بہت متعجب ہو جاتی ہے۔ اسی طرح زمانۂ قدیم کے انسان میں ممکن ہے ایسے ردعمل (Reaction) ہوئے ہوں مگر ان کا مذہب سے اس وقت تک کوئی تعلق نہیں ہوا جب تک وہ یہ خیال نہیں کرنے لگا کہ جو چیز ان کا باعث ہے وہ ایک غیبی طاقت ہے۔

اسی طرح یہ نظریہ بھی غلط ہے کہ انسان نے پہلے ایک مبہم طاقت کا تصور کیا اور پھر یہی چیز شخصی روحوں (Personal Spirits) میں تبدیل ہو گئی۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ روح کا سب سے پرانا نام "سایہ" (Shadow) ہے اور جب ہم اپنے آپ کو ایک قدیم وحشی کی جگہ دیکھتے ہیں تو ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ غالباً سایہ کے حیرت انگیز رویہ پر غور و فکر پہلی چیز تھی جس نے قدیم انسان کے دماغ میں تصور کی جھلک پیدا کی۔ اب سے سو برس قبل جب مشنریوں اور سیاحوں نے وحشیوں کے خیالات کا ریکارڈ رکھنا شروع کیا تو معلوم ہوا کہ ان میں سے کسی کے خیالات اخلاق پر مبنی نہیں ہیں اور بعض کے تو مذہبی خیالات بھی نہیں ہیں۔ بعض "ہمزاد" یا "سایہ" پر یقین کرتے ہیں اور بعض انسان کے "دوسرے حصے" پر جو موت کے بعد بھی زندہ رہتا ہے کامل اعتقاد رکھتے معلوم ہوتے ہیں۔

دوسری منزل یا حیات بعد الموت کا خیال بھی تمام دنیا میں متوازی نظر آتا ہے یعنی یہ کہ مردوں کی روحیں زندہ رہتی ہیں اور ان کی سرگرمیاں زیادہ بڑھ جاتی ہیں نیز یہ کہ 'ارواح' بہت رنجیدہ اور خشک مزاج ہوتی ہیں گویا زندگی ترک کرنے سے ان کو تکلیف پہونچی ہے اس کا اظہار وہ خشونت سے کرتی ہیں یا یہ کہ چونکہ اب وہ کسی کو نظر نہیں آتیں اس لئے وہ ایسے کام کرنے لگی ہیں جو پہلے گوشت و پوست کی زندگی میں راز کھل جانے کے ڈر سے نہ کر سکتی تھیں۔ بہرحال وجہ

کچھ بھی ہو، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر مذہب نے ایک وحشی کی زندگی کو کچھ عرصہ کے بعد تکلیف دہ بنانا شروع کر دیا تھا۔ ان ارواح کو تمام بیماریوں اور مصیبتوں کا ذمہ دار سمجھا جانے لگا۔ اور چونکہ ہر آدمی کے مرنے کے بعد ایک خبیث روح بڑھتی ہے لہذا انسانی آبادیاں انھیں 'ارواح' سے معمور نظر آنے لگیں۔ بعد کو وہ زمانہ آیا جب ان ارواح کی نسبت خاص جگہیں (مثلاً آسمان، یا زمین) میں مقرر کر دی گئیں۔ ان میں سے بعض ایسی بھی سمجھی جانے لگیں جو آدمیوں کی مدد کرتی ہیں لیکن عام نظریہ یہی تھا کہ وہ عموماً شریر ہوتی ہیں۔

مذہبی "مقدسین" کا ظہور مذہب کے اس ابتدائی دور پر زیادہ اظہار خیال کی ضرورت نہیں کیونکہ ہم نے انھیں مختصر الفاظ میں ہزاروں برس کے مذہبی ارتقا کا حال لکھدیا ہے۔ اب مذہب کے ارتقا کی دوسری منزل کو لیجئے جس میں "پادری" یا "مذہبی عالم" کا ظہور ہوا ہے۔ یہ دور ہر حصۂ دنیا میں یکساں طور پر پایا جاتا ہے گو وہ ہر جگہ مختلف شکلوں میں آیا ہو اور یہ جماعت گویا بُری روحوں سے مقابلہ کرنے کے لئے پیدا ہوئی تھی اور اس کی پوزیشن بھی ابتدا ہی سے عجیب و غریب تھی، ان "ارواحِ خبیثہ" کا مقابلہ کرنے میں مذہبی پیشواؤں کا طریق جنگ ایسا ہوتا تھا کہ بجز وحشیوں کے کوئی بھی اس پر ایمان نہیں لا سکتا تھا۔ وہ معمولی قسم کے 'ہپناٹزم' کی مدد سے کسی کو اچھا بھی کر سکتے تھے یا دشمن کو مار بھی سکتے تھے مگر اُن کے تمام کام محض اتفاقی واقعات کا نتیجہ ہوتے تھے۔

بہرحال جسوقت مذہبی "بزرگوں" کا یہ گروہ بڑھ رہا تھا اسی وقت مذہبی خیال میں بھی وسعت ہونی شروع ہوئی۔ انسانی افراد قبایل میں منقسم ہونے لگے اور ہر قبیلہ کا ایک سردار ہونے لگا۔ یہ سردار دوسری دنیا میں بھی سردار گنا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ انسان کی بڑھتی ہوئی قوت متخیلہ نے فطرت میں اور بھی کچھ طاقتور ہستیاں دیکھنا شروع کیں مثلاً سانپ، شیر وغیرہ اور آخر کار تمام نظام فطرت میں اُسے ارواح ہی ارواح نظر آنے لگیں، رفتہ رفتہ ان میں سے بعض "ارواح" دیوتا بن گئیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ مذہبی بزرگوں کی طاقت میں بھی اضافہ ہونے لگا یعنی جتنا بڑا دیوتا ہوتا تھا اتنا ہی عظیم المرتبت اس کا پوجاری ہوتا تھا اور نوبت یہاں تک پہونچی کہ اگر کسی دیوتا کے پوجاری زیادہ طاقتور ہوئے تو انھوں نے اپنے دیوتا کو نہ صرف دوسروں سے بڑھکر ثابت کرنے کی کوشش کی بلکہ ان کو دوسرے دیوتاؤں کا یا تو سردار بنا دیا یا دوسروں کو شیطان ثابت کر دکھایا۔ مصر، بابل اور چین سبھی جگہ یہی ہوا۔

گناہ کا بھوت لیکن وہ ترقی بھی بہت اہم تھی جو ان حالات کے ساتھ ساتھ مذہبی و اخلاقی مفاد کے اتحاد پر قایم ہو رہی تھی ابھی تک مذہبی اور اخلاقی خیالات الگ الگ نشو و نما پا رہے تھے مگر اخلاقیات کا سبق اس وقت سے شروع ہوا جب لوگوں میں یہ خیال پیدا ہونے لگا کہ ان کے قبائلی مراسم، ایک قانون ہیں جن پر عمل کرنا ضروری ہے۔ یہ لوگ سمجھتے تھے کہ ان کے گزشتہ سردار ان قوم جو بہت عقلمند تھے مرنے کے بعد دیکھ رہے ہونگے کہ ہمارے قبایلی قوانین پر ہمارے جانشین کہاں تک عمل کرتے ہیں۔ گویا مذہب یہیں سے 'اخلاق' کی طرف متوجہ ہوتا ہے

اس سے بظاہر یہی سمجھ میں آتا ہے کہ مذہب نے بہت جلد معلم اخلاقیات ہونے کی حیثیت حاصل کر لی لیکن تاریخ مذاہب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مذہب اسوقت تک اخلاقی نہیں ہوا جب تک اس کا معیار بہت اونچا نہیں ہو گیا۔ کہیں کہیں لوگ یہ خیال کر لیا کرتے تھے کہ ان کے دیوتا خرابیِ اخلاق سے ناراض ہو جاتے ہیں مگر زیادہ تر مذاہب میں اخلاقی عنصر نہیں پایا جاتا تھا۔ 'انصاف' ایک تمدنی چیز تھا یعنی اگر ایک آدمی، دوسرے کے ساتھ ناانصافی کرتا تو دوسرا اپنا انتقام لے سکتا تھا لیکن دیوتا عموماً کاہل ہوتے تھے جن کو ہر ہر بات میں چھیڑنا مناسب نہیں سمجھا جاتا تھا اور ان کی بہترین خدمت یہی سمجھی جاتی تھی کہ وہ اوپر اپنے تخت پر بیٹھے ہوئے اپنے بندوں کی قربانیوں کی خوشبو سونگھتے رہیں۔

شہوانی تعلقات سے بھی مذہب کو بہت عرصہ تک لگاؤ نہیں رہا۔ پرانی سوسائٹی میں ایک انسان کسی شہوانی غلطی کا مرتکب اُسی وقت سمجھا جاتا تھا جب وہ کسی دوسرے کی بیوی یا لڑکی کی عصمت خراب کرے اور اس کا یہ فعل صرف یہ حیثیت رکھتا تھا گویا ایک آدمی نے دوسرے آدمی کے مال کو چُرا لیا یا اس کو نقصان پہونچایا مگر تعداد ازدواج پھر بھی عام چیز تھی۔ عیسائی مبلغین کہتے ہیں کہ لوگوں کو گناہ کا خیال ہی نہیں ہوتا تھا اور یہ سچ ہے۔ ان کی سمجھ میں یہ نہ آتا تھا کہ ہم اپنی روزی چاہے جس طرح پیدا کریں لیکن خدا ناراض نہ ہو اور نفسانی خواہشات کسی طرح پوری کریں تو وہ برہم ہو جائے۔ بہرحال نسل انسانی کا ایک حصہ سن عیسوی کی ابتدا تک اعضاء شہوانی کی پرستش کرتا رہا اور دوسرے حصہ کا مذہب اخلاقی رہا۔ ۶ ہزار برس قبل، جب مصر میں تہذیب کی ابتدا تھی، تو اسیرس (Osiris) مُردوں کا جج سمجھا جاتا تھا اور اُس کے قانون میں ناجایز شہوانی تعلقات کی سزا بہت سخت تھی۔ اسی طرح شہنشاہیت بابل کے زمانہ میں بھی زنا وغیرہ کی سخت سزائیں تھیں۔

غرضکہ گناہ کا خیال سن عیسوی کی ابتدا سے بہت قبل پیدا ہو گیا تھا۔ انسان کی داستان حسب ذیل پانچ حصوں میں منقسم ہو سکتی ہے۔ (۱) پتھر کے اوزار معلوم ہونے سے قبل لاکھوں برس پیشتر کا زمانہ (۲) پتھر کے زمانہ سے قبل تقریباً ۵ لاکھ برس پیشتر کا زمانہ (۳) پتھر کا زمانہ۔ (اب سے ۳۔۴ ہزار برس پیشتر کا زمانہ) (۴) نیا پتھر کا زمانہ (تقریباً ۲۰ ہزار برس قبل مسیح سے ۳۵۰۰ برس قبل مسیح تک) (۵) تاریخی زمانہ۔ مذہب کی خاص ترقی خاص طور سے نئے پتھر کے زمانہ سے ہونا شروع ہوئی ہے اور اس کا ثبوت اس سے بھی ملتا ہے کہ مصر و بابل میں اخلاقی اور مذہبی خیالات پیدا ہونے شروع ہو گئے تھے۔

یہ ترقی بالکل قدرتی ترقی ہے۔ ایک طرف تو دیوتا تھے جو قوم کے اخلاق و عادات کی نگرانی کیا کرتے تھے دوسری طرف پادری یا مذہبی پیشوا تھے جو یہ ثابت کرتے تھے کہ خدا بدمعاشوں کو سزا دیتا ہے۔ بابلی یہ سمجھتے تھے کہ ہر مصیبت اور بیماری گناہوں کی پاداش ہے اور وہ اسوقت تک جاری رہے گی جب تک مذہبی پیشواؤں۔

کی وساطت سے، دیوتا گناہگار کو معاف نہ کردے۔ اسی طرح مصریوں کا یہ عقیدہ تھا کہ جب تک اسیر سن معاف نہ کردے مرنے کے بعد گناہوں کی سخت سزا ملتی رہے گی۔ ایران میں یہ خیال تھا کہ مزدہ ایک دن تمام دنیا کو تباہ و برباد کردیگا عبرانیوں کا بھی اسی طرح کا عقیدہ تھا۔ یونانیوں کا مذہب جزوی طور سے اخلاقی ضرور تھا مگر (Old Testament) تحریر کئے جانے سے قبل ان کا بھی یہ خیال تھا کہ اگر روح گندی ہوجائے تو انسان کو حیات ابدی اُسوقت تک نہیں میسر ہوتی جب تک وہ توبہ اور بعض مراسم کی ادائی سے پاک نہ کی جائے۔

رہا یہ سوال کہ مذہبی و اخلاقی قوانین و خیالات کا اختلاط قوم کے لئے مفید تھا یا نہیں، سو اس کا جواب دینے کی ضرورت نہیں۔ کہا جاتا ہے کہ زیادہ مناسب یہ تھا کہ اخلاقی قانون پر مذہبی اثرات کے ماتحت عملدرآمد کرایا جائے اور ایک شخص کی اخلاقی حالت کے مطابق سزا و جزا دیجائے۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ انسان اپنے عقاید کے ساتھ اپنے چال چلن کے باب میں جتنا زیادہ غیر منطقی رہا ہے اتنا اور کسی معاملہ میں نہیں رہا۔ کہا جاتا ہے کہ ازمنۂ وسطیٰ میں عیسائی قوموں کے درمیان اخلاقی قوانین (خصوصاً جنسی تعلقات کے بارہ میں) بہت سخت تھے مگر پھر بھی ہمیں کوئی خطۂ بجز مشرقی بحر روم کے جہاں اعضائے شہوانی کی پرستش ہوتی تھی) ایسا نظر نہیں آیا جو زمانۂ وسطیٰ کی ان قوموں سے زیادہ خراب چال چلن رکھتا ہو اس لئے یہ نظریہ صحیح نہیں معلوم ہوتا۔

گناہ کا خیال (جنسی تعلقات کے علاوہ) اس وقت پیدا ہوتا ہے جب یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ اخلاقی قانون کے مصنف دیوتا ہی ہیں مگر ایسے ثبوت کثرت سے پائے جاتے ہیں کہ ان خیالات سے قوم یا نسل کی اخلاقی حالت کو کوئی فایدہ نہیں پہونچا۔ کنفوشش، بودھ، زینوروسٹر (Zoroaster) اور اپی کورس (Epicurus) سب نے ایسے اخلاق کا درس دیا جس میں خدا کا نام نہ تھا مگر پھر بھی اپنی قوم پر ان کا اتنا ہی اثر ہوا جتنا کسی اور مذہبی معلم اخلاق کا۔

ایک عیسائی جو اس مسئلہ پر بحث کرنا چاہے زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتا ہے کہ گناہ کے مذہبی اور اخلاقی خیال نے جنسی تعلقات کو زیادہ خوشگوار بنا دیا۔ حالانکہ حقیقت یہ نہیں ہے کیونکہ پانچویں صدی عیسوی سے اُنیسویں صدی عیسوی تک جنسی اخلاق بہت آزاد رہا ہے۔ جنسی تعلقات کے بارہ میں اخلاقی درس کی بنیاد کا پتہ زمانۂ ماقبل تاریخ میں ملتا ہے یعنی اُن اوہام میں جن سے ہم کو اب تنفر ہے۔

ایک اور خیال یہ تھا کہ دیوتا چاہتے ہیں کہ ان کے لئے قربانیاں کی جائیں اور جتنی زیادہ قیمتی قربانیاں کی جائیں گی اتنا ہی وہ خوش ہوں گے۔ دراصل یہ نہایت طفلانہ نظریہ ہے کہ دیوتا بھی اتنے ہی خودسر اور جابر ہوں جتنا ایک مطلق العنان اور ظالم بادشاہ۔ مگر پھر بھی یہ اصل ہے اُس دوشیزگی کی جس کی حضرت عیسیٰ نے تعریف کی ہے اور اُن مقدس قسموں کی جو راہب یا راہبہ آج بھی کیتھولک فرقہ میں کھایا کرتے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ اُس حصہ میں بھی (یعنی شامی علاقہ میں) جہاں گناہوں کا مرکز تھا اور جہاں زناکاری ایک قسم کی عبادت شمار کی جاتی تھی، ایک ایسے قسم کے زہد اور ارتقار کا دور دورہ

ہوا جو راہبوں کی پرہیز گاری سے بڑھکر تھا۔ چنانچہ سائبل (Cybele) کی پجارنیں اگر اپنے خوبصورت جسموں کو مندر میں پرستش کے لئے آنے والوں کے حوالہ کر دیا کرتی تھیں تو دوسری طرف پجاریوں کو بھی مجبوراً انتیتین کاٹکر مندر پر چڑھانے پڑتے تھے۔ گویا ایک ہی آسمانی رحمت کے سایہ میں انتہائی عیاشی اور انتہائی زہد و اتقا دونوں پروان چڑھ رہے تھے۔

بے دینی یا الحاد کا عروج

آخری اخلاقی، مذہبی، ترقی حضرت عیسٰے کے ایک ہزار برس قبل ہوئی۔ یہ زمانہ تاریخ کے لئے بہت اہم شمار کیا جاتا ہے اور یہاں مذہب کی داستان نہایت اہم ہو جاتی ہے۔

ہر چند زمانہ تاریخ کے آغاز میں جب لوگوں کو لکھنا بھی آگیا تھا مذہب میں کئی خداؤں کے ماننے کا رواج پیدا ہو گیا تھا یعنی ہر قوم میں ارواح کے علاوہ دیوتا بھی کثیر تعداد میں پائے جاتے تھے اور ہر دیوتا کے الگ الگ پجاری اور مندر ہوا کرتے تھے اور ہر فرقہ کے مراسم بھی جداگانہ ہوتے تھے۔ لیکن حضرت عیسٰی سے دو ہزار برس قبل ہی روحانی خدا کا عقیدہ پیدا ہو گیا تھا۔ چنانچہ عبرانی پادری جنھوں نے پرانی انجیل (Old Testament) ایرانیوں اور بابلیوں کے اثرات کے ماتحت لکھی ہے اپنے مربی، بادشاہ سائرس (Cyrus) کو موحد مانتے ہیں قرطی (Cretons) بھی ہزاروں برس سے موحد تھے اور صرف زمین کو اپنا دیوتا تسلیم کرتے تھے۔ تعلیم یافتہ چینی بھی آسمان کو اپنا خدا مانتے تھے اور حضرت عیسٰی سے پانچویں یا چھٹی صدی قبل جب یونانی فلاسفر ایک خدا کا ذکر کرتا تھا تو معلوم ہوتا تھا کہ وحدانیت عام ہو چکی ہے مگر اس ایک خدا کی نسبت بھی انکار اور الحاد کا دور اُسی وقت سے شروع ہو گیا جب سے علم میں اضافہ ہونے لگا۔ اور یونانی مفکرین نے بھی (بے دینی) پھیلانی شروع کی چنانچہ تھیلس (Thales)، اناکسی مندر (Anaximander) دیاقرطیس (Democritus) وغیرہ کے نزدیک "خدا" صرف نام ہی نام ہے اسی طرح تیسری صدی قبل مسیح کے اسٹوئک (Stoic) اور اپیکورین (Epicurean) طبقے پورے مادہ پرست تھے

اب ذرا غور سے دیکھئے۔ مصر میں حضرت عیسٰی سے ایک ہزار برس قبل زوال کے آثار نمایاں ہونے شروع ہوئے، اس کی علمی ترقی ختم ہو گئی اور وہاں بہت پرانے پرانے اور نئے نئے مذہب پیدا ہونے لگے۔ بابل کو اسی زمانہ میں اسیریا (Assyria) نے تباہ کر دیا تھا مگر ہندوستان اور چین نے اپنی اپنی تہذیب قایم رکھی اور اپنے الحاد سے تمام تعلیم یافتہ طبقہ کو منسلک کر لیا۔ البتہ ہندوستان میں ایک جاہلانہ ردِ عمل ہوا اور گوتم بدھ نے جو تعلیم دی تھی وہ کالعدم ہو گئی چین کے اعلیٰ طبقہ میں مذہب نے کبھی اقتدار نہیں حاصل کیا اور یہ اثر جاپان تک پھیلا جہاں کا تعلیم یافتہ طبقہ بھی بے دینوں میں شامل ہے۔

ان سب باتوں کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جہاں کہیں آزادیٔ خیال لوگوں کو نصیب تھی وہاں مذہب، خواہ وہ وحدانیت

ہی کا کیوں نہ قایل ہو، بے دینی میں بدلنے لگتا تھا۔ یونانیوں کے تجربات اولیں سے بھی اس کا ثبوت ملتا ہے۔ ان لوگوں میں تحصیل علم و اشاعت علم کا اسقدر شوق تھا کہ انھوں نے تین صدیوں میں سائنس اور فلسفہ کی اتنی اشاعت کی کہ مصر اور بابل تین ہزار برس میں بھی نہ کر سکتے تھے۔ اور یہ سب کے سب بے دین، یا منکر دین، تھے۔ ہمارے پاس ان کی کتابیں موجود نہیں ہیں مگر بعد کے یونانیوں نے ان کے باب میں جو کچھ لکھا ہے اُس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ بالکل مادہ پرست تھے اور انکی کائنات مادی کائنات تھی! اس کے بعد یونان کی حالت دیکھئے جب وہاں کی تمام ریاستوں میں (بجز اسپارٹا کے) جمہوریت تھی اور ساری طاقت جاہل عوام کے ہاتھوں میں تھی۔ اسوقت وہاں ایک خاص مذہبی تقشف کی لہر دوڑ گئی اور مفکرین کو بہت اذیتیں برداشت کرنا پڑیں حتیٰ کہ سقراط کو بھی جو خدا پرست تھا جان دینا پڑی اور فلاطون کی بھی کسی نے نہیں سنی مگر جب دوبارہ علم کی اشاعت ہوئی تو پھر بے دینی میں ترقی شروع ہوئی اس کے بعد آخری زوال سے کچھ ہی زمانہ قبل جب ایتھنس میں تہذیب اپنے عروج پر تھی، تو مذہب حتیٰ کہ فلاطون کی عقلی خدا پرستی کا بھی زوال ہو چکا تھا۔ اس کے بعد یونان کی تہذیب، اسکندریہ کی طرف منتقل ہو گئی اور گو اسکندریہ کے ماہرین سائنس و ماہرین ریاضی کے خیالات سے کم واقف ہیں مگر ہمارے پاس یہ یقین کرنے کے کافی وجوہ نہیں کہ وہ بھی عموماً بے دین اور منکر تھے۔ اس کے بعد تہذیب، روم میں پہونچی اور وہاں اگرچہ عوام مذہب کے پیرو تھے مگر تعلیم یافتہ طبقہ میں وہی بیدینی پائی جاتی تھی جو اپنی کو بس کے الحاد اور اسٹوئک اخلاقیات سے ملکر پیدا ہوئی تھی۔

الغرض ایک ہزار سال کی مدت جو ۶۰۰ برس قبل مسیح سے شروع ہو کر ۴۰۰ برس بعد مسیح تک جاری رہتی ہے اور جس پر "پرانی دنیا" کا اختتام سمجھا جاتا ہے تاریخی اہمیت سے بھری ہے۔ ابھی تک علم صرف پادریوں اور پجاریوں تک محدود تھا اور مندر، اور عبادتگاہوں کے لئے حاصل کیا جاتا تھا۔ البتہ بابلی، علم نجوم میں ترقی کر رہے تھے مگر اس کے بعد دنیا کے حصہ میں مثلاً چین، ہندوستان، ایران، یونان، مصر اور روم) مفکر، اور معلم اخلاق پیدا ہونے لگے اور الحاد کا پھر عروج ہو گیا۔ فیثاغورث اور فلاطون وغیرہ چند مفکرین نے مذہب کو بے دینی کی اس رَو سے بچانا چاہا مگر ان کا اثر زیادہ دیر پا ثابت نہ ہوا۔ سن عیسوی کی ابتدا کے وقت تعلیم یافتہ لوگ عموماً بے دین تھے اور اس میں شک نہیں کہ اگر مغربی تہذیب مٹ نہ گئی ہوتی تو تعلیم یافتہ طبقہ، چین اور جاپان والوں کی طرح مستقل طور سے بے دین ہو جاتا۔

خود دور آخریں کا تجربہ ثابت کرتا ہے کہ طبقۂ اوسط کی تہذیب کی وسعت گویا بے دینی کی وسعت تھی۔ رومنوں نے عوام میں تعلیم پھیلانی شروع کر دی تھی۔ ابتدائی تعلیم اور مدرسے ہر شخص کے لئے عام تھے، اکثر کو ثانوی تعلیم دینے کی کوشش کی جاتی تھی اور چند کو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے میں بھی مدد دینے کا انتظام کیا گیا تھا۔ اگر یہی سلسلہ جاری رہتا تو مذہب بے دینی پر جا کر ختم ہو جاتا مگر بدقسمتی سے اُس کے بعد ۱۵ سو برس تک ایک ایسا زمانہ گزرا جب "کلچر" دفن کر دیا گیا تھا، غور و فکر کی آزادی سلب کر لی گئی تھی، اور انسانی دماغ کو معمولی کام کرنے سے بھی روک دیا گیا تھا۔

عیسائیت کی سچی داستان

یہ پندرہ سو برس کی مدت وہی ہے جسے 'عہد عیسویت' کہا جاتا ہے یعنی چوتھی صدی عیسوی کے نصف آخر سے (جب یورپ میں عیسائیت بہ جبر پھیلائی گئی) انیسویں صدی کے نصفِ آخر تک (جب آزادیٔ عقاید مل گئی تھی، سائنس کی اشاعت ہونے لگی تھی، عوام کو تعلیم دیجانے لگی تھی اور عیسویت اکثریت کے مذہب کی حیثیت سے ختم ہو چکی تھی) یہ وہ عہد تھا جب یورپ و امریکہ میں عظیم الشان اکثریت کا مذہب عیسائیت تھا۔

صاحبان کلچر باہم گربہت مختلف ہو سکتے ہیں اور یہ اختلاف، علمی و جذباتی دونوں طرح کا ہو سکتا ہے۔ ایک شخص کسی معاملہ کا بہت بڑا ماہر ہو سکتا ہے مگر ساتھ ہی مذہبی مسایل میں اس کی معلومات بہت ہی ناقص ہو سکتی ہیں۔ ایک آدمی خاص علم کے باب میں ایک زبردست نقاد بن سکتا ہے مگر یہ ضروری نہیں کہ مذہب کے متعلق بھی انتقادی اہلیت رکھتا ہو۔

غرضکہ دو ہزار برس پیشتر بھی مختلف اسکول پائے جاتے تھے۔ ایک اپیکورین جو روحانیت یا مذہب کے خیالات کو پس پشت ڈال کر انسانی مسایل کو انسانی نگاہ سے دیکھتا تھا اور دوسرا متصوفانہ (جس میں فیثاغورث، فلاطون، مارکس وغیرہ شامل تھے)۔ دوسرے قسم کے مفکرین نئے مذاہب چاہتے تھے چنانچہ کئی مذاہب قایم بھی ہو گئے۔ حضرت عیسیٰ نے سب سے پہلے یہ "روحانی" تعلیم دی کہ عیش و عشرت سے نفرت کی جائے اور گناہ سے خوف کیا جائے یہ نظریہ عیسیٰ کی پیدائش سے بہت قبل تمام دنیا میں پھیل چکا تھا اور سقراط، فیثاغورث، فلاطون، زینو اور مصر و ایران وغیرہ کے متعدد مفکرین کی بھی تقریباً یہی تعلیم تھی۔ حتیٰ کہ سائبل (محبت کی ایک دیوی) کا بظاہر شہوت پرست مذہب بھی اپنے پادریوں (مذہبی پیشواؤں) کو خصی ہو جانے پر مجبور کرتا تھا۔

پہلی صدی قبل مسیح کی یونانی، مصری، رومنی، دنیا اسی قسم کی روحانیت سے بھری تھی اس کے بعد عیسیٰ کے ماننے والوں کو تاریخ کے صفحات پر اُس وقت تک آنے کا کوئی امکان نہ تھا جب تک پال (Paul) نے عیسیٰ کو خدا نہیں بنا دیا اور ان کی موت کے افسانے تیار نہیں کر دئے۔ اس کے بعد یونانی عیسائیوں نے عیسیٰ کی ایسی سوانحعمریاں لکھنی شروع کیں جن میں مختلف مذاہب کے توہمات اور فرضی افسانے حضرت عیسیٰ سے منسوب کر دئے گئے اور اس صورت سے جو نیا مذہب تیار ہوا وہ یونان کے خیالات کا ایک مجموعہ تھا۔ اس نئے تیار شدہ مذہب میں ایک بھی اخلاقی خیال ایسا نہ تھا جو 'اُریجنل' ہو کیونکہ اس طرح کے افسانے اس وقت کے تمام مذاہب میں عام طور سے پائے جاتے تھے اور اس لحاظ سے حضرت عیسیٰ کی تصویر تموز (Tammuz) اسیرس Osiris، اڈونس Adonis وغیرہ کی روایات سے لی گئی تھی۔

مگر پھر بھی یہ نیا مذہب تین سو برس تک یونانی۔ رومنی دنیا میں کوئی اہمیت نہ حاصل کر سکا۔ البتہ اُس میں

ایک خاص بات یہ ضرور پیدا ہو گئی کہ حضرت عیسیٰ کے مفروضہ احکام اور مشن کے خلاف پادریوں نے مخصوص اُصول مذہب (Dogmas) پیدا کر لئے۔ تاہم ۱۵۰۰ عیسوی تک وہ اپنے حلقہ میں ۱۰ لاکھ سے زیادہ حلقہ بگوش پیدا نہ کر سکے اور اب گزشتہ نصف صدی میں وہ دس کروڑ عقیدتمندوں سے ہاتھ دھو چکے ہیں۔ اس کے علاوہ تاریخ عیسوی کی یہ داستانیں کہ عیسائیوں کا متعدد مرتبہ قتل عام ہوا یہ بھی اب غلط سمجھی جاتی ہیں اور تعلیم یافتہ لوگ ان قصوں کو نہیں مانتے۔ صرف چند سو آدمیوں کے قتل کا حال بیشک تاریخ سے ثابت ہوتا ہے ورنہ باقی افسانہ ہی افسانہ ہے۔

سب سے بڑا اور خاص "قتل عام"، تیسری صدی عیسوی میں ہوا تھا جب عیسائیوں نے شہنشاہ روم سے گستاخی کی تھی اور سلطنت روم کی طرف سے جنگ کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ جب یہ "قتل عام" شروع ہوا تو اسوقت عیسائیوں کے صرف دو گرجے تھے اور تمام روم میں ان کی تعداد دس ہزار سے زیادہ نہ تھی، ان کے علاوہ کچھ مغربی یورپ میں بھی پائے جاتے تھے۔ چنانچہ اس سزائے عام میں کچھ لوگ تو اٹلی کے مارے گئے، اور کچھ دوسرے حصوں کے لیکن روم کے چند ہزار عیسائیوں کی اکثریت نے اپنا مذہب بدل دینا منظور کر لیا۔ اور جب چوتھی صدی کا آغاز ہوا تو عیسائیت کی حالت نہایت ذلیل و خوار تھی۔ یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ مسلمان تو دو سو برس میں تین تہذیبوں کے مالک ہو گئے اور عیسائیت تین سو برس کے بعد بھی دیوالیہ ہی رہی۔ واقعہ یہ ہے کہ مذہبی لٹریچر میں تاریخ کا حصہ انتہائی کذب بیانی پر مشتمل ہے۔ خیر۔ اس کے بعد شہنشاہ قسطنطین نے جو ایک رومن افسر اور شرابخانہ کی ایک فاحشہ عورت کا لڑکا تھا جنگ کر کے تخت سلطنت حاصل کیا اور اس نئے مذہب کی سرپرستی کرنے لگا۔ یہ سوال کہ خود اس نے اس مذہب کو کہاں تک قبول کیا متنازع فیہ ہے، مگر یہ واقعہ ہے کہ اُس نے اس مذہب کے ماننے والوں کے ساتھ مراعات کیں، اس مذہب کو قبول کرنے والوں کی ہمت افزائی کی اور اپنے لڑکوں اور جانشینوں کو عیسویت کی تعلیم دی لیکن ۵۰ برس کے شاہی اثرات اور مشرق میں جور و ظلم کے باوجود عیسائیت صرف اقلیت تک محدود رہی اور روم کے تقریباً تمام امرا "کافر" ہی رہے۔ آخر کار قیصران روم کو اس پر آمادہ کیا گیا کہ وہ تمام روم کو بہ جبر عیسائی بنائیں۔ چنانچہ اس طرح اور صرف اسی طرح، صلیب نے اپنے حریفوں کے معبدوں کھنڈروں پر فتح حاصل کی! اور یہ ایسے تاریخی واقعات ہیں جن سے انکار ممکن نہیں۔

دوسری تاریخی غلطی کی تصحیح یہ ہے کہ عیسائیت کے پھیلنے کے بعد اخلاقیات میں کوئی ترقی نہیں ہوئی بلکہ ۱۰ برس کے اندر اندر یورپ میں زمانۂ جاہلیت کی یاد پھر تازہ ہو گئی تھی۔ یہ امر حقیقت کے بالکل منافی ہے کہ عیسائیت نے اسکول قایم کرائے، غلاموں کو آزاد کرایا، عورتوں کے رتبہ میں اضافہ کیا یا خیرات اور رحم و کرم کے دور کا آغاز کیا۔ دراصل عیسائیت نے اس کے بالکل برعکس کیا۔ اس نے اسکولوں کا خاتمہ کر دیا، عورتوں کو ذلیل و خوار کر دیا، "کافر" رومنوں کی فیاضیوں کو ملیامیٹ کر دیا اور نفس پرستی اور ظلم و جفا کی سرپرستی کی۔

عیسائیت کے طرفدار کہتے ہیں کہ تہذیب کی بربادی گوتھ اور وندال اقوام نے کی نہ کہ عیسویت نے۔ لیکن جو مورخ ہیں وہ اس عذر لاطایل کی مطلق وقعت نہیں کرتے کیونکہ شہادتیں اس کے برعکس پائی جاتی ہیں۔ یونان کی عیسائی مملکت پر کبھی ان وحشی قبایل نے حملہ نہیں کیا مگر پھر بھی اُس نے کوئی ترقی نہ کی اور بداخلاقیوں ہی میں پڑی رہی۔ خود سلطنت روما کے مغربی حصہ میں یہ "وحشی" اتنے درندہ اور بدتہذیب نہ تھے جتنا ان کو پیش کیا جاتا ہے۔ تھیوڈرک (Theodoric) اور شارلمین (Charlemagne) نے تہذیب میں اضافہ کرنا چاہا تھا مگر پادریوں نے صرف یہی نہیں کہ اس کی امداد نہ کی بلکہ اُس کی ساری اسکیم کو ناکامیاب کر دیا۔ دوسری طرف مذہب اسلام کی ایک خام پیداوار یعنی عربوں نے جو قوم ٹیوٹن (Teuton) ہی کی طرح شدت پسند اور جاہل تھی یونانی اور ایرانی کلچر کو حاصل بھی کیا اور خود اپنی شاندار تہذیب کو رواج دیا۔ لیکن اس کے بالکل برخلاف عیسائیت چھ صدی تک جہالت درندگی اور وحشت کا ایک مجموعہ رہی اور بحیثیت مجموعی یورپ کی بداعمالیوں، بےعنوانیوں اور جہالت کا تو تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ سائنس ختم ہو چکی تھی اور سو میں ایک تنفس بھی تعلیم یافتہ نہ تھا۔ فنون لطیفہ، (بجز ایک قلیل مدت کے جب کہ جرمنی میں فن تعمیر سازی میں کچھ ترقی ہوئی تھی) بارھویں صدی تک گوشۂ گمنامی میں پڑے رہے۔ بارھویں صدی تک مشکل سے کوئی اسکول یا لائبریری دکھائی پڑتی تھی۔ شہروں کی آبادی ۲۰ ہزار سے زیادہ کی نہ ہوئی تھی اور بڑے سے بڑے قصبہ میں صفائی کا مطلق انتظام نہ تھا۔ انصاف کے ساتھ مذاق کیا جاتا تھا اور سزائیں انتہائی وحشیانہ ہوتی تھیں اور افسوس تو یہ ہے کہ گوتھ اور وندال کی تاراج کردہ زمین کو عیسائیت نے اس قابل بھی نہ بنایا کہ اس میں ایک پھول بھی نکل آتا۔ تاریخ، عیسائیت کے اس دعوائے بےدلیل پر ہنستی ہے کہ اس کے مذہب میں تہذیب کا عنصر موجود تھا عیسائیت کو تہذیب کی اشاعت کے لئے دوسرے مذاہب سے زیادہ موقع تھے مگر اس علمبردارانہ تہذیب نے دنیا کو غیر مہذب ہی رکھا!

تہذیب کی تجدید

اس کے بعد بارھویں صدی سے یورپ میں تہذیب از سر نو قائم ہونے لگی۔ بارھویں صدی، اس لئے کہا گیا ہے کہ یہیں سے تہذیب یورپ میں کئی چیزوں کی ابتدا ہوتی ہے مثلاً گوتھک آرٹ، کی ابتدا، یونیورسٹیوں کا قیام، تجارت کی ترقی، بڑے بڑے شہروں کا وجود، غلاموں کی آزادی وغیرہ — لیکن اس کے ساتھ ہی ہمیں یہ نہ فراموش کر دینا چاہیئے، ہر چند عہد وسطیٰ در اصل انیسوں صدی تک قایم رہا، لیکن تہذیب یورپ کی حالت بارھویں صدی ہی سے در اصل سنبھلنا شروع ہو گئی تھی۔ اور جو کچھ اصلاحات ہوئیں وہ یا تو عیسائیت سے قطعاً بےنیاز ہو کر ہوئیں یا اُس کے علی الرغم۔ مگر حیرت انگیز امر یہ ہے کہ تہذیب یورپ کی تمام تاریخ محض "چرچ" (پادریوں) کو خوش کرنے کے لئے بدل دی گئی ہے، حالانکہ عہد وسطیٰ میں فنون لطیفہ کی ترقی (جس پر "چرچ" فخر کرتا ہے) اس وجہ سے ہوئی کہ صاحبان آرٹ نے پرانے معیار کو پس پشت ڈال دیا تھا۔ غلاموں کی آزادی اقتصادی (

ومعاشرتی وجوہ کی بنا پر ہوئی اور پادریوں کا طبقہ ہی وہ طبقہ تھا جس نے اس پالیسی پر سب سے آخر میں عمل کیا۔ عملی زندگی کا احیار اور دوسرے فنون کی ترقی اسپین میں مسلمانوں کی شاندار تہذیب کی بدولت ہوئی اور اُس بنیاد پر جس پر پوپ کے اثرات نے یورپ کے کسی ملک میں کوئی عمارت نہیں قایم کی تھی اسپین میں عربوں نے ایک صدی کے اندر تہذیب کا ایک لاجواب معیار قایم کر دیا تھا۔ غرضکہ یورپ میں سائنس کی اشاعت مسلمانوں کی بدولت شروع ہوئی مگر عیسائی پادریوں نے ان حیرت انگیز ترقیوں کو آیندہ تین صدیوں تک ملتوی رکھا۔ یورپ میں تہذیب کی ازسرنو پیدائش میں یونانی لٹریچر کو جو حصہ دیا گیا ہے وہ بھی بہت بڑی حد تک مبالغہ آمیز ہے۔ اس تہذیب کا سب سے بڑا باعث اسپین کے "مور" (مسلمانوں اور سسلی کے عرب ہیں۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ یونانی اور لاطینی کتابوں نے اٹلی، فرانس اور انگلستان میں تعلیم یافتہ طبقہ کے خیالات سدھارنے میں بہت مدد کی۔

عیسائیت کا طرفدار اکثر اپنے مذہب کی حمایت میں کسی خانقاہ، یا کسی پادری، یا کسی لائبریری کا (جو کہیں کہیں ایک آدھ صدی میں دکھائی پڑتی ہیں) نام لیتا ہے اور بڑے فخر سے کہتا ہے کہ دیکھو یہ سب مذہب کی برکت ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ ایک دو صدی میں کسی ایک پادری کا کوئی فعل یا کسی ایک لائبریری کا قیام مذہب کی حقانیت کو نہیں ظاہر کرتا بلکہ "عیسائی چرچ" کی پالیسی اس کے پادریوں، اسقفوں اور پاپاؤں کی اکثریت کے افعال سے ظاہر ہوتی ہے اور یہ پالیسی انسانیت کے نقطۂ نگاہ سے انتہائی مہلک رہی ہے۔ پاپاؤں اور پادریوں کی کثیر تعداد ہمیشہ خودغرض اور اخلاقی اعتبار سے نہایت نفس پرست رہی۔ غرضکہ یورپ میں جن چیزوں نے تہذیب کے پھیلانے میں امداد دی ان میں مذہب کا ہاتھ بالکل نہیں اور جس قسم کی بھی یورپ میں ترقی ہوئی اس میں عیسائیت ذرا بھی ممد و معاون نہیں ہوئی۔ "اصلاح مذہب" کی تحریک جس نے پاپائے روم کی طاقت کو صدمہ پہونچایا البتہ ایک مذہبی خدمت تھی مگر اس 'اصلاح' نے بھی ایک ایسی خانہ جنگی کی بنیاد ڈالی جس کا اثر عرصہ تک قایم رہا اور انقلاب فرانس تک نہ زایل ہو سکا البتہ اس کے بعد یورپ میں جب دماغی اصلاح، شروع ہوئی تو وہ صرف اس نظریہ کی بدولت کہ "علم" مذہب کے لئے مہلک ہے اور ترقی تہذیب سے مراد ہے لامذہبیت کی ترقی" اور اس تمام مدت میں جہالت اور شایستگی یا نور و نار میں برابر جنگ ہوتی رہی۔ مشرقی یورپ میں "انکار عقائد" نویں صدی ہی سے پھیلنے لگا تھا حتی کہ ملکہ تھیوڈورا نے اُسی صدی میں پال کے ایک لاکھ معتقدین کو ہلاک کرا دیا اور دسویں صدی میں ایک اور بادشاہ نے ان کے ۲ لاکھ آدمیوں کو بلگیریا کے ویرانوں میں جلاوطن کر دیا۔ یہ لوگ اگرچہ "انجیل نو" کو مانتے تھے مگر چونکہ ان کے اعتقادات بظاہر مذہب مانوی پر مبنی تھی اس لئے ان کی تحریک دراصل عیسائیت کے خلاف ایک تحریک تھی۔ اس کے علاوہ اطالوی شہروں میں بھی مسلمان عربوں کے اثر کی وجہ سے ایک قسم کی مہذب بے دینی عام ہو چلی تھی۔ پاپائیت نے ان منکرین کی خون کی ندیاں بہا دیں مگر پھر بھی یہ تحریک لوتھر کے زمانہ تک چلتی رہی۔ اس کے بعد اسی سلسلہ میں لوسی فر کا فرقہ پیدا ہوا اور کئی

زبردست بلوے بھی ہوئے جن میں لاکھوں آدمیوں کی جانیں کام آئیں۔ قصہ مختصر یہ کہ نشاۃ الثانیہ کی پوری مدت میں پاپائیت نے تقریباً دس لاکھ سے زیادہ آدمیوں کی جانیں لیں اور لاکھوں کو مختلف صعوبتوں میں مبتلا رکھا۔ اور اگر مذہبی جنگوں کے مقتولین بھی شامل کر لئے جائیں تو ان "شہداء" کی تعداد نہ معلوم کتنی لاکھ ہو جائے ــــ!

یورپ کی تاریخ ان واقعات کی تصدیق کرتی ہے اور یہ امر پایہ تحقیق کو پہونچ جاتا ہے، جیسے جیسے علم میں ترقی ہوئی ویسے ہی انکار مذہب میں ترقی ہوئی حتیٰ کہ موجودہ زمانہ کی ترقی تعلیم نے اس بے دینی یا انکار مذہب میں اور زیادہ اضافہ کر دیا اور جس قانون کا تذکرہ کیا گیا ہے وہ دنیا کے اُس سرے سے اِس سرے تک صحیح ثابت ہوتا چلا آیا ہے

مستقبل کی لامذہبیت

اس مضمون سے یہ معلوم ہو گیا ہوگا کہ مذہب کے مستقبل کے بارہ میں کوئی پیشینگوئی کسی مخصوص آدمی کی رائے پر منحصر نہیں ہے بلکہ ہم کو وہ قانون معلوم ہو گیا ہے جو ہر زمانہ میں سچا ثابت ہوتا چلا آرہا ہے، یہ سوال البتہ کیا جا سکتا ہے کہ اگر علم کا نتیجہ 'الحاد' ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ اتنے تعلیم یافتہ لوگ مذہب کو اب بھی مانتے ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ عوام کے مذاہب کا ارتقاء وحدانیت اور پھر بے دینی ہے، دنیا، جسمانی حیثیت سے ایک منزل سے دوسری منزل تک نہیں جاتی ہے اور تعلیم یافتہ آدمیوں میں بھی مزاج کا اختلاف پایا جاتا ہے۔ ایک آدمی یہ کہہ سکتا ہے کہ وہ عیسائی ہے یعنی حضرت عیسیٰ کا مداح۔ دوسرا حضرت عیسیٰ کی مدح کرنے کے باوجود اپنے آپ کو عیسائی کہنے سے اُس حالت میں گریز کرے گا جبکہ وہ عیسائی مذہب کو نہیں پسند کرتا۔ ایک شخص کہہ سکتا ہے کہ وہ خدا پر ایمان رکھتا ہے اور دوسرا کہہ سکتا ہے کہ اس کا خدا پر کوئی اعتقاد نہیں مگر پھر بھی ایک 'عالمگیر قوت' کا دونوں کو احساس ہو سکتا ہے ایک آدمی مختلف علوم کا ماہر ہو سکتا ہے مگر اس کا بھی امکان ہے کہ اُس نے مذہب پر کبھی غور نہ کیا ہو،

بہرحال یہ طے شدہ امر ہے کہ مذہب بحیثیت ایک مجموعۂ عقاید کے تعلیم یافتہ طبقہ سے اپنا اثر زایل کرتا جا رہا ہے اور چونکہ آج کل تعلیم عام ہو چلی ہے اس لئے یہ بھی صحیح ہے کہ گویا عوام پر سے اُس کا اثر زایل ہو رہا ہے۔ یہ مسئلہ مذہب میں اصلاح کرنے کا نہیں ہے کیونکہ اگر اس نظریہ کو مان لیا جائے تو پیغمبروں پر حرف آتا ہے۔ نہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اُصول مذہب سے انکار کر کے صرف اخلاقیات کو مانا جائے کیونکہ اس نظریہ کو ایک قلیل اقلیت کے علاوہ اور کوئی نہ تسلیم کریگا اور ان سب کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ مذہب کا زوال یقینی ہے۔

اسی کے ساتھ ان واقعات سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ خدا پرستی کا زوال بھی لازمی ہے، ہم دیکھ رہے ہیں کہ گزشتہ ۵۰ برس سے وحدانیت کس طرح اپنی جگہ پر قایم ہے اور الحاد کتنا پھیل رہا ہے۔ لہٰذا اب جبکہ علم عام ہو رہا ہے مستقبل کا حال ظاہر ہے۔ خدا کے خیال کو اب خواہ کتنا ہی پاکیزہ کیوں نہ بنایا جائے، مگر وہ باقی نہیں رہ سکتا گزشتہ نصف صدی میں کئی مذاہب پیدا ہوئے اور ان کے معتقدین کی تعداد بڑھانے کی بہت کوشش

کی گئی مگر پھر بھی ان کے پیروؤں کی تعداد میں ۲۰ لاکھ سے زیادہ اضافہ نہیں ہوا حالانکہ ۲۰ کروڑ آدمی ایسے پیدا ہو گئے ہیں جو مذہب سے بالکل بے پروا ہیں۔ درانحالیکہ ہمارے نصاب تعلیم میں مذہب پر خاص زور دیا جاتا ہے کہ بہرحال مذہب کا خاتمہ اب کچھ مدت کی بات ہے!۔ اس کے ساتھ ہی ذرا اس صورت حال پر نظر ڈالئے کہ (صرف عیسائی ممالک میں) مبلغین مذہب کی تعداد تقریباً ۵ لاکھ ہے کہ ان کے مقابلہ میں بے دینی پھیلانے والے ۵۰۰ کے تناسب سے زیادہ نہیں۔ اس پر طرہ یہ کہ مذہب کی طرف سے کروڑوں روپیہ بھی ہر سال خرچ ہوتا ہے۔ کیا اس حالت پر غور کرنے کے بعد بھی مذہب کے مستقبل کے متعلق کوئی شک باقی رہ جاتا ہے!۔ تعلیم یافتہ ممالک میں تو مذہب تقریباً ختم ہو گیا ہے البتہ جاہل ملکوں میں اکثریت مذہب کی پابند ہے مگر وہ بھی اُسوقت تک اُسے مانتی رہے گی جب تک وہاں تعلیم عام نہیں ہوئی۔ اب یہ سوال کہ تعلیم کب عام ہوگی، اس کا ابھی جواب نہیں دیا جا سکتا، بہرحال کچھ بھی ہو، اس صدی کے آخر میں اگر کہیں مذہب قایم بھی رہا تو وہ انتہائی نفرت خیز چیز ہوگی۔

یاد رکھئے کہ مذہب کا خاتمہ وہ مبارک گھڑی ہوگی جب ہم مردہ انسانوں سے مدد مانگنے کے بجائے اپنی عقل سے امداد کے طالب ہوں گے اور ہم میں ایک ایسی زندگی پیدا ہو جائے گی جو تمام زندگیوں سے لطیف تر، خوشگوار تر اور مرغوب تر ہوگی!!!

تمام وہ اصحاب

جنھوں نے مجموعہ استفسار کی پہلی دو جلدیں خریدی ہیں

براہ کرم نوٹ فرمالیں کہ تیسری و آخری جلد شایع ہونے کے بعد دو روپیہ رعایت قیمتی پر (علاوہ محصول) ان کے نام غالباً اخیر اکتوبر میں ذریعہ وی۔ پی روانہ کر دیجائیگی اگر اس دوران میں انکی ممانعت کا خط نہ آگیا۔

یہ جسارت نہ صرف خریداران نگار کے علمی و ادبی ذوق کے بنا پر کی جاتی ہے بلکہ اس لئے بھی کہ پہلی دو جلدیں بغیر تیسری جلد کے زیادہ مفید نہیں ہو سکتیں اور ہر شخص پورا سٹ ہی رکھنا پسند کرے گا۔

"منیجر" نگار"

مکتوبات نیاز

جانِ نیاز ۔ جو کچھ تم کہتے ہو بالکل درست ہے، اس لئے نہیں کہ تمھاری ہر بات پر "بجا" کہدینا میری خو ہے بلکہ اس بنا پر کہ چڑھتے ہوئے دھارے اور خس و خاشاک کا مقابلہ ہی کیا تاہم اگر تم یہ چاہو کہ "نقطۂ نظر" کا اختلاف دنیا سے مٹ جائے سو یہ ممکن نہیں۔ سیلاب کا جوش و خروش کشتیوں کو ڈبوتا ہی رہے گا اور کشتیاں اس میں ڈوبتی ہی رہیں گی

فلاطون کی "خم نشینی" دنیائے علم و فلسفہ کا نہایت اہم واقعہ ہے لیکن ایک شاعر کا تو بین! آمیز لب و لہجہ ملاحظہ کیجئے، کہتا ہے :-

بہ خم نشست فلاطوں ز شرم آب نہ شد
بہ حیرتم کہ فلاطوں شد و شراب نہ شد

کجا فلاطوں ہو جانا" اور کجا "شراب بن جانا"، لیکن خم کا ذکر ہو اور ایک رند بادہ خوار کو شراب کا خیال نہ آئے، محال ہے خم میں بیٹھکر فلاطوں کو یہ ناز کہ وہ "فلاطوں" بن گیا، شاعر کہتا ہے اسے شرم آنی چاہئے کہ خم میں بیٹھکر فلاطوں تو ہو گیا لیکن "شراب" نہ بن سکا ـــــ یقیناً بہت مضحکہ خیز خیال ہے، لیکن اس اعتماد و وثوق کو دیکھو جس نے شاعر سے یہ شعر لکھوایا۔ بہر حال میں تم سے متفق تو نہیں ہو سکتا لیکن تمھاری مخالفت کر کے اپنی جان کو عذاب میں مبتلا کرنا بھی مجھے گوارا نہیں۔ اس لئے سوائے "درست و بجا" کے میں اور کیا کہہ سکتا ہوں

تمھاری دنیا "تمہارا تیاب" ہے اور میری دنیا وہ جو شباب کھونے کے بعد حاصل ہوئی ہے۔ تم اُس دور سے گزر رہے ہو جس میں صرف حال ہی حال ہے، میں اُس منزل میں ہوں جہاں یادِ ماضی کے سوا اور کچھ نہیں، یعنی جو چیز تمھاری "کارگاہ" ہے وہ میرا "تخیل کدہ" ہے، تم زندہ ہو اور میں صرف زندگی کا خواب دیکھ رہا ہوں مجھے تو یونہی سرگرداں رہنے دو۔ تمھاری کامیابیوں سے خوش ہوتا ہوں اور ان کے قیام و دوام کا متمنی ہوں۔ اس سے زیادہ اور کیا چاہئے۔ میں اگر عملاً تمھارا شریک نہیں تو نہ ہوں، بلا سے، اگر اُصولاً میں تم سے متفق نہیں تو تمھیں اسکی خلش کیوں ہو۔ خار زار سے دامن کشاں گزر جانے کا سلیقہ جن کو حاصل ہے، وہ کیوں کانٹوں میں اُلجھیں۔

حضرت ۔ میں قیامت تک ماننے کے لئے طیار نہیں کہ آپ کوشش کریں اور ناکامیاب رہیں۔ صاف صاف یوں کیوں نہیں کہدیتے کہ مجھے کیا غرض پڑی ہے پرائے پھٹے میں پاؤں ڈالوں۔ دنیا کے اُصول کے مطابق یقیناً یہ عذر ایسا نہیں جس کے خلاف کوئی شخص زبان کھول سکے، لیکن میں اپنے دل کو کیونکر سمجھاؤں جو آپ کی طرف سے کسی قسم کی بے اعتنائی کا یقین کرنے کے لئے طیار ہی نہیں ہوتا۔

میں کہتا ہوں آپ نے ٹالدیا دل کہتا ہے کہ یہ ممکن نہیں۔ میں پوچھتا ہوں حصولِ مقصود میں پھر اتنی دیر کیوں ہے، وہ کہتا ہے، قسمت!

میں کیا دنیا میں کسی کے لئے بھی "مایوسی" کوئی نئی چیز نہیں، لیکن آپ کی طرف سے مایوسی یقیناً میرے لئے بالکل نئی چیز ہے اور نہیں کہہ سکتا کہ اس کا عادی ہونے کے لئے مجھے اور کتنی تمنائیں آپ سے وابستہ کرنا پڑیں گی۔ بہرحال ایک بار پھر عرض کرتا ہوں کہ

دستے بہ دستگیری من دآستیں برآر

اور نتیجہ کا منتظر ہوں۔

مصدرِ لطف وکرم ۔ عطوفت نامہ پہونچا، آنکھوں سے لگایا۔ اللہ اللہ، ایک زمانہ تھا جب ہر وقت کی حضوری حاصل تھی اور کامرانی کا یہ عالم تھا کہ ۔۔۔ جسوقت آنکھ کھُل گئی دیدار ہوگیا ۔۔۔ یا اب یہ دورِ محرومی کہ مہینوں گزر جائیں اور آپ یہ بھی نہ پوچھیں۔

سعدیا بر تو چہ رنج ست کہ بگداختۂ

آپ پوچھتے ہیں کہ حال کیسا ہے شاعرانہ جواب تو صرف یہی ہوسکتا ہے کہ "پوچھنا اب ہمارے حال کا کیا" لیکن حقیقت یہ ہے کہ زندگی کی محرومیوں سے جی تنگ آگیا ہے اور

کوئی دن گر زندگانی اور ہے
ہمنے اپنے جی میں ٹھانی اور ہے

کہا جاتا ہے کہ دنیا کی ہر چیز میں تدریج ہے، لیکن میں دیکھتا ہوں کہ شباب وشیب کے درمیان کوئی ایسی منزل نہیں جہاں انسان ایک لمحہ کے لئے بھی ٹھہر کر یہ غور کرسکے کہ کیا چیز ہاتھ سے جارہی ہے اور کیوں۔

اکبر الہ آبادی کہتا ہے:۔

دنیا کی کیا حقیقت اور ہم سے کیا تعلق
وہ کیا ہے اک جھلک ہے، ہم کیا ہیں اک نظر ہیں

اس شعر کی حقیقت اب سمجھ میں آئی ہے۔ ہر چند دنیا کو اک "جھلک" کہنا صرف اپنی مختصر "فرصتِ نگاہ" کے لحاظ سے ہے نہ کہ از روئے حقیقت، تاہم وہ چیز جو اپنا حصہ نہیں، کسی کا بھی نہیں۔

بہر حال اب یہ دور بھی ختم ہو رہا ہے اور نہیں کہا جا سکتا کہ پلکیں کب ایک دوسرے سے مل جائیں، آپ کو دیکھنے کی آرزو تو خیر اب کیا پوری ہو سکتی ہے۔ لیکن بسا غنیمت ہے اگر کبھی کبھی اس آرزو کے اظہار ہی کی فرصت نصیب ہو جائے۔

سنو جی - جس وقت میری طبیعت کھلنڈرے پن کی طرف مایل ہو، اسوقت مجھ سے سنجیدہ باتیں نہ کیا کرو۔ بھلا ایسے زمانہ میں جبکہ خدا کی شانِ عفو و کریمی پر اعتماد کرنے اور اس کے بھلا دینے کو جی چاہتا ہو، ایسی باتیں کرنا کہاں تک مناسب ہیں۔

تم کہ لڑکپن میں ایک طرف حجام تمھاری سر خراشی کیا کرتے تھے اور دوسری طرف مولوی تمھاری دماغ خراشی کیا سمجھ سکتے ہو کہ خدا اگر ہے تو وہ منطقی حدود سے بالا تر ہے۔

تمھاری سمجھ میں یہ بات کبھی نہیں آسکتی کہ خدا کو سمجھنے کی ضرورت ہی نہیں ہے اور اگر ہے تو اس کے لئے نہ فلسفہ چھاننے کی ضرورت ہے نہ الٰہیات کی کتابوں کی۔ مختلف حالتوں میں، مختلف کیفیات کے تحت مختلف دلایل اس کے پیش کئے جا سکتے ہیں، مثلاً آجکل تم مجھ سے پوچھو تو میں بلا تامل کہہ دوں گا کہ خدا کے وجود کی اس سے زیادہ مستحکم دلیل اور کوئی نہیں ہو سکتی کہ اس نے عورت پیدا کی، شراب پیدا کی اور ماش کی دال ـــــ مگر میں جانتا ہوں کہ یہ بات تمھاری سمجھ میں نہ آئے گی۔ اچھا یہ موسم گزر جانے دو، یہ کالے کالے بادل ختم ہونے دو، اس کے بعد غور کرونگا کہ خدا کس صورت میں میرے سامنے جلوہ گر ہوتا ہے۔

صدیقی - ابھی ابھی مکرمت نامہ ملا۔ پڑھکر سخت حیرت ہوئی۔ میں کبھی یقین نہیں کر سکتا تھا کہ ـــــ کی طرف سے اس قسم کی شکایت آپ کو پیدا ہو سکتی ہے۔ نہ اس لحاظ سے کہ ان پر آپ کے احسانات ایسے معمولی نہیں کہ وہ کبھی سر اٹھا سکیں، بلکہ اس خیال سے بھی کہ آپ سے منحرف ہو کر وہ سوائے نقصان کے کوئی فایدہ نہیں اٹھا سکتے۔

آپ نے جس محبت و دلسوزی سے اس واقعہ کا ذکر کیا ہے، وہ آپ کے اخلاق کی بلندی کی ایسی زبردست مثال ہے کہ وہ محسن کش تو خیر کیا لیکن میں شرم سے آب آب ہوا جاتا ہوں۔ آپ ہی بتایئے میں کیا کروں۔ نامناسب نہ ہو تو مجھے اجازت دیجئے کہ اُن حضرت سے مل کر پوچھوں کہ یہ آخر اُن کو سوجھی کیا تھی۔ اور جو کچھ وہ کہیں اسے آپ کو مطلع کر دوں۔

ہر چند میں جانتا ہوں کہ وہ کوئی معقول بات نہ کہہ سکیں گے اور بُرائی کے لئے کوئی معقول توجیہ ہو بھی کیا سکتی ہے تاہم اس سے یہ فایدہ ضرور ہوگا کہ تجھے ملامت کرنے کا موقعہ مل جائے گا اور یہ الجھن کچھ کم ہو جائے گی۔

فتنۂ دوراں ، خط ملا۔ ہر چند میں جانتا ہوں کہ تم یہاں کس بُری نیت سے آرہے ہو لیکن یہ بھی جی نہیں چاہتا کہ تمھیں آنے سے باز رکھوں۔ بہر حال آؤ اور آفتیں ڈھاؤ۔

گرچہ می دانم نگاہت فتنہ است اما مخواب

مگر یہ تو بتاؤ کہ "پیر و مرشد" کا ذکر اس قدر مایوسی کے ساتھ کیوں کیا گیا۔ تم کو معلوم ہونا چاہئے کہ وہ ہمارے میکدہ کا سب سے پرانا "مُغ" ہے، اور شراب جتنی پُرانی ہوتی ہے اتنی ہی زیادہ "رسا" ہو جاتی ہے۔ اور پھر یہاں تو ابھی معاملہ "فرو ریزد پر و بال" کا بھی نہیں ہے۔ جس وقت وہ داڑھی صاف کر کے، بالوں میں خضاب لگا کر، مونچھوں کو کاسمٹک سے نوکیلا بنا کر بیٹھتے ہیں، اسوقت دیکھو کیا عالم ہوتا ہے۔ وہی دلکشی و رعنائی، وہی ولولہ و برنائی! وہی دہکتا ہوا شباب وہی ٹپکتا ہوا شہاب!

میں نے اُن سے اچھی طرح تمھاری غیبت کر دی ہے۔ اس لئے پوری طیاری کر کے آنا مقابلہ ہوش کھو دینے کا ہوگا، ہوش میں رہنے کا نہیں۔

کرم گستر! ۔ آج سے ایک ہفتہ قبل الہ آباد کی ایک تحریر سے (یہ نہ پوچھئے کہ تحریر کس کی تھی) مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ میر صاحب ہجرت کر کے کہیں جا رہے ہیں اور آپ بھی رسمِ وداع ادا کرنے لکھنؤ تک تشریف لائیں گے۔ خوشا نصیب سرزمین لکھنؤ کے کہ ایسے زبردست مہاجر و "مجاہد فی الدین" کے قدم چومنے کا شرف اسے حاصل ہو، لیکن آپ جو اہتمام چاہتے ہیں وہ میرے بس کی بات نہیں۔

آپ شوق سے میرے یہاں قیام فرما سکتے ہیں، لیکن قبلہ میر صاحب کی مہمانداری ان کے شایانِ شان مجھ سے ممکن نہیں۔ ان کے زہد و تقدس کا مجھے اعتراف ہے، میں یہ بھی جانتا ہوں کہ وہ بہت کھلے ڈلے انسان ہیں لیکن یہ رات بھر کی موجِ مے میری برداشت سے باہر ہے۔ علاوہ اس کے ایک بات اور بھی ہے اور وہ یہ کہ آجکل میرے ایک دوست میرے ہی مکان پر رہتے ہیں اور بہت صبح اُٹھکر ریاض کرتے ہیں، ممکن ہے میر صاحب کی شب بیداریوں میں انکی موسیقی حایل نہ ہو، لیکن ہو سکتا ہے کہ ان کے گانے میں کوئی حرج واقع ہو اور یہ مجھے کبھی گوارا نہ ہوگا۔

معاف فرمائیے، میں نے صاف صاف اس لئے لکھدیا کہ آیندہ کوئی بدمزگی کی صورت پیدا نہ ہو اور آپ مجھے ترکِ دوستی کی دھمکی دینے پر آمادہ نہ ہو جائیں۔ یہ ہو سکتا ہے کہ میں کسی اور مکان کا انتظام کر دوں اور انکے دورانِ قیام میں جتنے مصارف ہوں ان کا بار میں برداشت کروں۔ اگر یہ نامناسب نہ ہو (اور نامناسب ہونے کی کوئی وجہ نہیں) تو براہِ کرم مجھے فوراً مطلع فرمائیے تاکہ میں مکان حاصل کر کے اس میں ضروری سامان پہونچا دوں۔

باب الاستفسار

کیا شریعتِ اسلامی میں تغیر و تبدّل ممکن نہیں؟

(جناب سید اصغر حسین صاحب۔ رانچی)

آپ کی تحریروں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ شریعت اسلامی میں آپ تغیر و تبدل ضروری سمجھتے ہیں، درانحالیکہ اگر اس اصول کو صحیح مان لیا جائے تو پھر اسلام کی کوئی متعین صورت باقی نہیں رہ سکتی اور وہ ایک بدلتے رہنے والے مذہب کی شکل اختیار کر لیگا، براہِ کرم اس مسئلہ پر ذرا وضاحت سے نظر ڈالئے۔ ممنون ہوں گا۔

(نگار) آپ نے استفسار کر کے ایک نہایت اہم بحث چھیڑ دی ہے کیونکہ اسی تنگ خیالی نے مسلمانوں کو اسوقت تک ترقی سے باز رکھا اور اسی غلط فہمی نے اسلام کی صورت کو مسخ بنا دیا ہے۔ کیا آپ نے کبھی اس پر غور فرمایا ہے کہ اسلام و شریعت دونوں ایک چیز ہیں یا ان کا مفہوم جداگانہ ہے اور اسی کے ساتھ یہ بھی کہ اگر یہ ایک ہیں تو کیوں اور مختلف ہیں تو ان دونوں میں باہم کیا تعلق ہے۔

آپ جس چیز کو لفظ شریعت سے تعبیر کرتے ہیں وہ فی الحقیقت فقہ اسلامی ہے اور آپ نہیں اکثر مسلمان اسی غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ فقہ اور مذہب اسلام دونوں ایک چیز ہیں اس لئے آیئے سب سے پہلے میں آپ کو بتاؤں کہ فقہ کی حقیقت کیا ہے۔

اس میں کلام نہیں کہ شریعت یا فقہ نام ہے اس مجموعۂ قوانین کا جو مسلمانوں کی مذہبی، سیاسی، معاشرتی اور تمدنی زندگی پر حاوی ہے اور جس کی حدود سے ان کی انفرادی یا اجتماعی زندگی کا کوئی پہلو بچا ہوا نہیں ہے۔ لیکن یہ دعویٰ کرنا کہ ہمارے اسلاف جو قوانین وضع کر گئے ہیں ان میں تغیر و تبدل کی ضرورت نہیں یا یہ کہ ان سے ہٹنا مذہب اسلام سے ہٹ جانا کسی طرح درست نہیں ہو سکتا۔

آپ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ اس زمانہ میں فقہ کے مفہوم کو جو اتنی زبردست وسعت دیدی گئی ہے وہ ابتدار عہد اسلام میں مفقود تھی۔

اگر آپ نے تاریخ اسلام کا مطالعہ کیا ہے تو آپ کو یہ علم حاصل ہوگا کہ قرونِ اولیٰ میں فقہ کے ساتھ ہی ساتھ ایک اور چیز بھی پائی جاتی تھی جس کا اصطلاحی نام علم تھا اور جو فقہ سے بالکل جدا حیثیت رکھتی تھی۔

علم سے مراد قرآن و تفسیر کا علم تھا اور اُن روایات کا جو رسول اللہ اور صحابہ سے منسوب کی جاتی تھیں لیکن فقہ سے (جیسا کہ اس کے لغوی معنی سے ظاہر ہے) مراد عقل و رائے کے بعد کسی نتیجہ تک پہونچنا تھا اسی لئے کبھی کبھی الفاظ فقہ اور رائے مترادف حیثیت سے استعمال کئے جاتے ہیں۔ الغرض علم اور فقہ دو بالکل علٰحدہ علٰحدہ چیزیں تھیں اور اسی بنا پر مجاہد نے (من یوتی الحکمۃ) کی تفسیر میں ظاہر کیا ہے کہ صاحب حکمت سے مراد وہ شخص ہے جو قرآن علم اور فقہ کا ماہر ہو۔ ہارون الرشید اپنے گورنر ہر شمہ کو ہدایت کرتا ہے کہ وہ ہمیشہ "اولوالفقہ فی الدین" اور "اولوالعلم بکتاب اللہ" سے مشورہ کرتا رہے۔ الغرض عالم اور فقیہ دو بالکل جداگانہ حیثیت رکھتے ہیں اور اسی بنا پر ابن عمر کے متعلق کہا جاتا تھا کہ وہ جید الحدیث تھے لیکن "جید الفقہ" نہ تھے اور ابن عباس افقہ و اعلم دونوں سمجھے جاتے تھے۔ بالفاظ دیگر گویا یوں سمجھئے کہ عالم وہ شخص کہلاتا تھا جسے صرف قرآن اور روایات کا علم ہو اور فقیہ وہ کہلاتا تھا جو جدید مسایل میں غور و فکر کے بعد خود اپنی رائے سے کام لیکر کوئی فیصلہ کرے۔

جب اسلام بالکل ابتدائی دور سے گزر کر ارتقاء کی دوسری منزل میں آیا اور فتوحات کی وسعت کے ساتھ اسے غیر قوموں کے تمدن اور نئے نئے مسایل سے واسطہ پڑا تو بہت سی باتیں ایسی نظر آئیں جن کا ذکر نہ کلام مجید میں تھا نہ رسول اللہ کے اقوال میں، اس لئے جن علماء کو عدل و انصاف کی خدمت سپرد کی گئی تھی وہ اپنی عقل و رائے سے کام لیتے تھے اور کوشش کرتے تھے کہ جہاں تک ممکن ہو علم و رائے دونوں مل جائیں۔ اسی کا نام "تفقہ فی الدین" تھا اور جو اس میں سب سے زیادہ کامیاب ہوتا تھا اسی کو سب سے بڑا فقیہ سمجھا جاتا تھا۔ الغرض شریعت اسلامی میں جو مرتبہ علم قران و حدیث کا تھا وہی بلکہ اس سے زیادہ رائے کا تھا کیونکہ بغیر اس کے کام چلنا دشوار ہو جاتا۔ ایک بار امیر معاویہ نے جناب زید بن ثابت سے کسی امر میں قانونی مشورہ کیا لیکن "فلم یوجد عندہ او عندہم فیہا علم" (نہ وہ کوئی روایت پیش کر سکے نہ دیگر حضرات) آخر کار امیر معاویہ نے اپنی ذاتی رائے سے فیصلہ کیا۔ ایک بار مصر کے قاضی نے خلیفہ عمر ثانی سے کسی معاملہ کے متعلق دریافت کیا۔ آپ نے جواب دیا کہ مجھ تک اس باب میں کوئی روایت نہیں پہونچی اس لئے خود اپنی رائے سے کام لیکر فیصلہ کر دو۔

بنو امیہ کے زمانہ تک باقاعدہ تنظیم شریعت نہ ہو سکی تھی لیکن بنو عباس کے دور میں البتہ باضابطہ قانون سازی کی ابتدا ہوئی اور اس کے چار اصول مقرر کئے گئے:۔ قرآن۔ سنت۔ قیاس اور اجماع۔ چنانچہ ان اصول پر

فقہ اہل السنت کی جو کتاب سب سے پہلے مرتب کی گئی وہ مالک بن انس کی مُوطّا ہے۔ اسوقت علاوہ مدینہ کے شام، عراق اور ہسپانیہ میں بھی مختلف حضرات اپنی اپنی فقہ مرتب کر رہے تھے لیکن سب سے زیادہ شہرت و مقبولیت مُوطّا ہی کو حاصل ہوئی۔ اس کے بعد عراق کی رائج کردہ فقہ کو حماد بن ابی سلیمان نے سنبھالا اور پھر ابو حنیفہ نے اس کو چار چاند لگا دئے اور بعد کو ان کے دو شاگرد ابو یوسف اور محمد کی خدمات تدوین شریعت میں بہت مقبول ہوئیں اور انھیں کی مرتب کردہ فقہ پر آج کل اہل سنت عمل کر رہے ہیں۔

یہ تھا نہایت مختصر سا بیان تدوین فقہ کی تاریخ کا لیکن اس کے ساتھ آپ کو یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ مسایل شریعت میں تمام مسلم جماعتوں کا اتفاق کبھی نہیں ہوا اور ٹھیک اسی وقت جبکہ قیاس و رائے سے کام لیکر قوانین و قواعد مرتب ہو رہے تھے ایک جماعت ایسی بھی تھی جو اس کی سخت مخالف تھی اور وہ کہتی تھی کہ قرآن و حدیث میں کیا چیز نہیں ہے کہ ہم کو قیاس و رائے سے کام لینا پڑے۔ بعد کو یہ اختلاف برابر بڑھتا ہی گیا اور کبھی کوئی ایسی شریعت قایم نہ ہو سکی جس پر تمام سنیوں نے بھی اتفاق کیا ہو، چہ جائیکہ شیعہ اور خوارج وغیرہ کو اگر ان کو بھی لے لیا جائے تو پھر اختلاف کی کوئی انتہا نہیں رہتی

اس بیان سے دو باتیں واضح ہو گئیں ایک یہ کہ جس چیز کو شریعت اسلامی سے تعبیر کیا جاتا ہے وہ کوئی منصوص چیز نہیں ہے، یعنی نہ خدا کی نازل کی ہوئی چیز ہے اور نہ رسول اللہ کی بنائی ہوئی اور دوسرے یہ کہ مسلمانوں میں کبھی کوئی ایسی شریعت نہیں پائی گئی جس پر بالاتفاق سب کا عملدرآمد رہا ہو۔ اب اس حقیقت کو سامنے رکھ کر غور کیجئے کہ آپ کا یہ دعویٰ کرنا کہ شریعت یا فقہ میں تغیر و تبدل کو راہ دینا اسلام کو خراب کرنا ہے کس حد تک درست ہو سکتا ہے۔

اس بحث میں آپ لوگ اس حقیقت کو بالکل فراموش کر دیتے ہیں کہ دین و مذہب دو علٰحدہ علٰحدہ چیزیں ہیں۔ دین سے مراد وہ اُصول عقاید ہیں جو تمام افراد میں جزو مشترک کی حیثیت رکھتے ہیں اور جن سے کسی کو اختلاف نہیں ہو سکتا مثلاً یہ کہ خدا ایک ہے اور محمد اسکے رسول ہیں، لیکن اس کے علاوہ جو کچھ ہے وہ مذہب ہے اور اس میں اگر اختلاف بھی ہو تو اس کا اثر "وحدت فی الدین" پر نہیں پڑتا۔ اور اسی بناء پر ایک زمانہ سے یہ کہتا چلا آرہا ہوں کہ شیعہ سنی کے جھگڑے دین سے کوئی تعلق نہیں رکھتے اور ان کا تعلق ان مسایل سے ہے جو ہماری دینی مرکزیت یا اسلامی اشتراک پر کسی طرح اثر انداز نہیں ہو سکتے۔

مذہب جس میں ہمارے سیاسی، معاشرتی اور تمدنی قوانین سب شامل ہیں کبھی متفق علیہ چیز نہیں ہو سکتا اور نہ ایک جگہ قایم رہنے والی چیز ہے۔ کیونکہ زمانہ کے ساتھ ساتھ ہمارے تمدن، ہماری معاشرت، ہمارے عادات و اطوار اور ہماری ضروریات میں تغیر ہونا ضروری ہے اور تہذیب یا کلچر کے اس تغیر کے ساتھ ہمارے اجتماعی نظام کا بدلنا بھی لازم ہے۔ چنانچہ آپ دیکھئے کہ آج خود ہمارے علماء کرام کی تہذیب و معاشرت کیا ہے۔ کیا یہ بالکل وہی ہے جو عہدِ رسالت و خلافت میں پائی جاتی تھی۔ اگر نہیں ہے تو آپ ان سے بھی کہہ سکتے ہیں کہ انھوں نے شریعت کی پابندی نہیں کی کیونکہ

قانون اسلامی میں ہمارے لباس وغیرہ کے مسایل بھی شامل ہیں۔

اس سے تو آپ کو انکار نہ ہوگا کہ علوم وفنون کی ترقی نے اسوقت زمان ومکان دونوں کے مفہوم کو بدلدیا ہے اور تجارت نے ہر ملک وقوم کو ایک دوسرے سے وابستہ کردیا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ زندگی کے مشاغل بہت وسیع ہوگئے ہیں اور ایسے ایسے مسایل ہمارے سامنے آگئے ہیں، جن کا اب سے قبل وجود تو خیر کیا، وہم وگمان بھی نہ تھا۔ ظاہر ہے کہ جب رسول اللہ کے بعد ہی معاشرت کی گتھیاں سلجھانے میں لوگوں کو قرآن واحادیث سے ہٹ کر قیاس ورائے سے کام لینے کی ضرورت پڑی تو اب کہ زمانہ اتنی ترقی کرچکا ہے اور ہزاروں نئی باتیں پیدا ہوگئی ہیں، ہم قیاس ورائے سے کیونکر قطع نظر کرسکتے ہیں اور وہ شریعت جو اب سے صدیوں سال قبل مرتب ہوئی تھی وہ ہماری موجودہ زندگی میں کیا کارآمد ثابت ہوسکتی ہے ــــ قانون ہمیشہ اقوام کی زندگی کے ساتھ ساتھ بدلتا رہتا ہے اور اگر کسی مذہب میں اتنا لوچ نہیں ہے کہ وہ ضروریات ملک وملت کے لحاظ سے اپنے اندر تبدیلی پیدا کرسکے تو وہ قطعاً بے روح مذہب ہے اور زیادہ عرصہ تک قایم نہیں رہسکتا ــــ اگر میں یہ کہتا ہوں کہ شریعت میں تبدیلی کی ضرورت ہے تو کوئی نئی بات نہیں کہتا بلکہ اسی مطالبہ کا اعادہ کرتا ہوں جو قرون اولیٰ میں اکابر دین کی طرف سے کیا گیا تھا اور جس کا نتیجہ آپ کی موجودہ شریعت ہے۔

ظاہر ہے کہ سرزمین عرب میں جو قوانین مرتب کئے گئے تھے ان میں وہیں کی آبادی اور اس زمانہ کے مقامی ماحول کو پیش نظر رکھا گیا ہوگا کیونکہ آج تک کبھی ایسا نہیں ہوا کہ آج چین میں بیٹھکر لندن کے لئے قانون وضع کیا جائے اور لندن میں بیٹھکر چین کا۔ یا یہ کہ اسوقت ہم کوئی ایسی شریعت مرتب کردیں جو ہزار سال بعد بھی کام دیسکے۔ پھر کیا آپ کہہ سکتے ہیں کہ جو وقت فقہ حنفی تیار ہوئی ہے اسوقت اہل عرب کو اس کا علم حاصل تھا کہ ایک وقت ہندوستان میں بھی اسلام پھیلے گا اور ان کو اپنے ملکی ضروریات کے لحاظ سے فلاں فلاں امور میں رشاد وہدایت کی ضرورت لاحق ہوگی۔ یقیناً نہیں۔ پھر آپ کیونکر اس کا دعویٰ کرسکتے ہیں کہ شریعت اسلامی ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے بھی اتنی ہی مفید وکارآمد ثابت ہوسکتی ہے جتنی اب سے سیکڑوں سال قبل عرب کے باشندوں کے لئے تھی اور اس میں اب کسی تغیر وتبدل کی گنجایش نہیں ــ اس سلسلہ میں ایک بات البتہ قابل غور ہے (اور وہ بھی ان لوگوں کے لئے جو بہت زیادہ قدامت پرست ہیں) وہ یہ کہ فقہ اسلامی میں بعض مسایل ایسے ہیں جن کی صراحت قرآن مجید میں موجود ہیں، بعض احادیث سے لئے گئے ہیں اور بعض قیاس ورائے سے کام لیکر اجتہاد کئے گئے ہیں۔ اس لئے ہوسکتا ہے کہ قرآن مجید میں جو مسایل مذکور ہیں ان کو جوں کا توں رہنے دیا جائے اور وہ ایسے ہیں بھی نہیں جن میں تغیر کی ضرورت زیادہ محسوس کی جائے، لیکن احادیث وقیاس کے رد سے جو حصہ فقہ اسلامی کا مرتب ہوا ہے اس کو بدلا جاسکتا ہے اگر اسکی ضرورت محسوس ہو ــ ایسا کرنے سے اصل دین کو کوئی صدمہ نہیں پہونچ سکتا کیونکہ قرون اولیٰ میں بھی برابر اسی اصول پر عملدرآمد رہا ہے اور اس کو سامنے رکھے بغیر شریعت اسلامی ہر زمانہ وہر ملک کے ضروریات کا ساتھ نہیں دیسکتی۔ رہا یہ اعتراض کہ اب سے ایک ہزار سال قبل کا انسان تو اجتہاد سے کام لے سکتا تھا اور اب اس کو یہ حق حاصل نہیں ہے۔ سو اسکے جواب میں بجز اس کے اور کیا کرسکتا ہوں کہ معترض کے سامنے بیل گاڑی اور ہوائی جہاز دونوں کو پیش کرکے خاموش ہوجاؤں ــ